प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

NIZAM RAMPURI KI SHAIRI KA TANQEEDI JAYEZA

A Dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

in

Urdu

Submitted by

MOHD YAQOOB

Reg. No. 19HUHL10

Supervisor

Dr. A. R. Manzar

UNIVERSITY OF HYDERABAD
सा विद्या या विमुक्तये

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046
Telangana, India

December 2022

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

نظام رامپوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار

محمد یعقوب

19HUHL10

نگراں

ڈاکٹر اے۔آر۔منظر

UNIVERSITY OF HYDERABAD
सा विद्या या विमुक्तये

شعبۂ اُردو
اسکول آف ہیومانیٹیز
یونیورسٹی آف حیدرآباد
حیدرآباد 500046
تلنگانہ، انڈیا

دسمبر ۲۰۲۲ء

Date: 29/12/2022

DECLARATION

I, **MOHD YAQOOB** hereby declare that this dissertation entitled **"NIZAM RAMPURI KI SHAIRI KA TANQEEDI JAYEZA"** submitted by me under the guidance and supervision of **Dr A. R. Manzar,** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my dissertation can be deposited in Shodganga / INFLIBNET.

Name: **MOHD YAQOOB**

Signature of the Student

Reg. No. 19HUHL10

Date: 29/12/2022

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation entitled **"NIZAM RAMPURI KI SHAIRI KA TANQEEDI JAYEZA"** submitted by **MOHD YAQOOB** bearing Registration No. **19HUHL10** in partial fulfillment of the requirements for the award of Master of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma.

This is also to certify that **MOHD YAQOOB** participated in the Two-Day National Seminar on *"Urdu Adab Mein Hindaustani Anasir: 1947 Ke Baad"* held on 9th & 10th February 2022. He has presented the paper titled ***"Novel Dilmun Mein Hindustan Ki Qadeem Tehzeebi Wa Saqafati Muzmeraat"*** Organized by Department of Urdu, School of Humanities, University of Hyderabad, (Hyderabad, Telangana.

Signature of the Supervisor
Dr. A. R. Manzar

//Countersigned//

Head
Department of Urdu

Dean
School of Humanities

AZADI KA AMRIT MAHOTSAV

Collaboration with Student Welfare Department, Chief Warden Office and Department of Urdu, University of Hyderabad

Two-day National Seminar on

"Urdu Adab Mein Hindustani Anasir: 1947 Ke Baad"

held on 9th & 10th February 2022.

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

CERTIFICATE

This is to certify that Dr./ Mr./ Ms. MOHD. YAQOOB DEP. of URDU. UNIVERSITY OF Hyderabad- *of* .... *has presided/ attended as resource person/ participated/ presented a paper titled* NOVEL, [illegible] MEIN HINDUSTAN KI QADEEM TEHZEEBI WA SAQAFATI MUZAMMIRAT.

in Tow-day National Seminar in URDU ADAB MEIN HINDUSTANI ANASIR 1947 KE BAAD held on 9th & 10th February 2022.

Dr. Arshia Jabeen	**Dr. Mohd. Kashif**	**Prof. Syed Fazlullah Mukarram**	**Prof. G. Nagaraju**
Seminar Co-ordinator	Seminar Co Co-ordinator	Head	Dean
Department of Urdu,	Department of Urdu,	Department of Urdu	Student Welfare
University of Hyderabad	University of Hyderabad	University of Hyderabad	University of Hyderabad

SI No. 15256

Notification No. 2

हैदराबाद विश्वविद्यालय

UNIVERSITY OF HYDERABAD

(A Central University Established by an Act of Parliament)

P.O. CENTRAL UNIVERSITY, GACHIBOWLI, HYDERABAD - 500 046 (INDIA)

SEMESTER GRADE TRANSCRIPT

REGULAR EXAMINATION

REG. NO. 19HUHL10

NAME OF THE STUDENT MOHD YAQOOB

MONTH AND YEAR OF EXAM NOV 2019

SEMESTER 1

COURSE M.Phil. URDU

PARENT'S NAME MOHD NOOR / HAMEEDAN BEGUM

COURSE NO	TITLE OF THE COURSE	GRADE	CREDITS	RESULTS
UR701	RESEARCH METHODOLOGY	B	4	PASS
UR702	PRACTICAL CRITICISM	A	4	PASS
UR721	TEXTUAL CRITICISM	B+	4	PASS

SEMESTER GRADE POINT AVERAGE (SGPA) :**8.00**

(In words) :**EIGHT POINT ZERO ZERO**

Date Of Result Notification : **Dec 17, 2019**

Pattern of Evaluation is based on 6 letter grades on a 10 point scale.

LETTER GRADE	A+	A	B+	B	C	F
CREDITS	10	9	8	7	6	0

Date Of Download : **Jan 10, 2020**

DEPUTY REGISTRAR
(ACAD & EXAMS)

This is system generated certificate issued by O/o The Controller of Examinations, University of Hyderabad

Website: https://www.uohyd.ac.in and https://www.acad.uohyd.ac.in
Phone : 040-23132120, E-mail: ce@uohyd.ernet.in and ceuoh@uohyd.ac.in

فہــرست ابــواب

پیش لفظ	2
باب اوّل: دبستان رامپور	10
الف: ریاست رامپور کی مختصر تاریخ	11
ب: دبستان رامپور کے شعراء	25
باب دوم: نظاؔم رامپوری کی سوانح حیات	36
باب سوم: نظاؔم رامپوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ	64
ماحصل:	120
کتابیات:	130

پیش لفظ

پیش لفظ

سب سے پہلے میں اللہ رب العالمین کا شکر گزار ہوں کہ جس کے رحم وکرم سے میرا مقالہ پائے تکمیل کو پہنچا۔ ایم فل میں داخلہ ملنے کے بعد سب سے پہلے موضوع کے انتخاب کا معاملہ درپیش آیا دوست واحباب اور اساتذائے کرام سے مشورہ کرنے کے بعد مقالہ کے لیے جو موضوع تجویز ہوا وہ ؔ''نظاؔم رام پوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ ہے''

ادس مقالے کو میں نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول۔ دبستان رامپور۔

باب دوم۔ نظاؔم رام پوری کی سوانح حیات۔

باب سوم۔ نظاؔم رام پوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔

اردو کی ترویج وترقی میں اصناف شاعری نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو کے آغاز سے لے کر اب تک مختلف شعراوادباء نے اپنی شعری تخلیقات کے ذریعہ سے اردو کو لوگوں تک پہنچایا، اوراس کی آبیاری کی ہے۔ اردو اپنے وجود میں آنے کے ساتھ شمال سے جنوب تک اپنی شیرینی بکھیرتی گئی جس کو ادیبوں وصوفیا کرام نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

دکن میں آغاز ہی سے مثنویاں لکھی جارہی تھیں۔ جس میں میراجی شمس العشاق، شاہ فخر دین نظاؔمی، برہان الدین جاؔنم، مقیؔمی، وجہؔی وغیرہ نے مثنویوں کے ذریعے واقعات وحادثات کو منظوم شکل میں پیش کیا۔ جس کے ذریعہ اردوادب کو فروغ ملا۔ شمال میں بھی شاعروں اورادیبوں نے اردو زبان کو اپنی تخلیق کا حصہ بنایا اور لوگوں نے اسے بڑی دلجمعی اور دلچسپی سے ادب کی آبیاری کی ہے شمالی ہند میں میر آؔثر کی مثنوی خواب وخیال اور مثنوی سحرالبیان اور گلزارنسیم وغیرہ کی اہمیت کی حامل ہیں۔

شمال میں شعروشاعری کا مرکز 1700ء کے پہلے سے ہی تھا۔لیکن جب ولی کا دیوان ء1719ء میں دہلی آیا تو یہاں کے شاعروں نے عام بول چال کی زبان میں شاعری کرنا شروع کی جس میں خان آرزؔو، آبرؔو، حاتمؔ، شاکر ناجیؔ، مضمونؔ وغیرہ ہیں۔اس کے بعد میرتقی میرؔاور مرزا محمد رفیع سوؔدا کا دور آیا جس کو اردو شاعری کا عہدے زرّیں کہا جاتا ہے۔اس دور میں اردو شاعری خوب پھلی پھولی میرؔ کے کلام کے چرچے ہر جگہ عام تھے۔سودا کی غزلیں بھی اور اردو ادب میں خوب چرچے تھے۔اسی طرح سے شاہ نصیرؔاور مومنؔ وغیرہ نے شاعری میں اپنی اپنی ذاتی کیفیت کے عناصر کو بھی پرویا ہے۔ان کے بعد کے شعرا میں داغؔ دہلوی کا زمانہ آتا ہے۔جنہوں نے دیگر شاعروں کی طرح اپنی شاعری میں ان عناصر کو جگہ دی جو سامعین و قارئین کے دل کے سکون کا سبب بنے جس میں عشق و عاشقی سے لے کر ذاتی اور اجتماعی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ان کلاسیکی شعراء نے اپنی شاعری میں تشبیہات واستعارات کے انتخاب سے فن کو فننیت بخشی۔فارسی الفاظوں کے استعمال کو سوا سمجھا۔انہیں کلاسیکی شعراء میں ایک نام نظامؔ رامپوری کا بھی ہے۔جنہوں نے اپنی شاعری میں عشق و عاشقی کے داستان کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔تغزل، معاملہ بندی، تصوف کے ساتھ عشق مجازی، عشق حقیقی، نظامؔ رامپوری کی شاعری کی ممیّزات میں شامل ہے۔اس لئے ان کی صف میں کھڑے ہونے کا شرف حاصل ہوا۔جیسے داغؔ دہلوی غالبؔ، قائمؔ چاندپوری جلالؔ لکھنوی وغیرہ۔

باب اول : دبستان رامپور۔اس میں دو ذیلی عنوان ہیں۔

الف :ریاست رام پور کی مختصر تاریخ۔

ب :دبستان رامپور کے شعراء۔

باب دوم : نظامؔ رام پوری کی سوانح حیات۔

باب سوم : نظامؔ رام پوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔

باب اول۔دبستان رامپور(الف) ریاست رامپور کی مختصر تاریخ

ریاست رامپور کی تاریخ ایک ہزار سال پرانی تاریخ ہے۔ایک ہندو راجا سروا نے دریائے گنگا کے کنارے سیفنی گاؤں کے پاس ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا یہیں سے ریاست رامپور کی تاریخ کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔اس قلعہ کے پاس ''رمپورا'' نام کا ایک گاؤں تھا جس کے نام پر اس ریاست کا نام رامپور پڑا۔

موجودہ دور میں ضلع رامپور کے شمال میں اترا کھنڈ کا ضلع ادھم سنگھ نگر، مغرب میں مراد آباد، مشرق میں بریلی ،اور جنوب میں بدایوں، ہے اس ذیلی عنوان کے تحت ریاست رام پور کے نوابین کا مختصر تعارف اردو ادب میں ان کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، جس میں خصوصیت کے ساتھ نواب یوسف علی خان ناظم جو اردو کے اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ اور جن کی بدولت دبستان رامپور خوب پھولا پھلا انکی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور نواب فیض اللہ خان جو ریاست رامپور کے پہلے نواب تھے۔ نواب محمد سعید خان نواب کلب علی خان وغیرہ کا اجمالی تعارف اور ان کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب اول (ب)۔ اس باب کے ذیلی عنوانات میں ان شعراء کا ذکر موجود ہے، جو ہندوستان کی الگ الگ جگہوں سے رامپو میں رآ کر پناہ لی۔ 1857ء کے حالات کے پیش نظر ان شاعروں کا ریاست رامپور میں آنے کی غرض وغایت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ریاست رامپور ایک ایسی ریاست ہے جہاں اردو شعراء وادبا کی مدد کی گئی اور انہیں پناہ دی گئی۔ اس ریاست میں کلاسیکی دور کے بڑے بڑے شعراء وادبا دوسری جگہ سے یہاں پر تشریف لائے جس میں امیر مینائی، داغؔ دہلوی، جلالؔ لکھنؤ ی، قائمؔ چاند پوری، اور غالبؔ جیسے بڑے شاعروں کے نام موجود ہیں۔ اس دبستان میں اردو شاعری اور اردو ادب کی خوب ترقی ہوئی جس طرح دبستان دہلی، و دبستان لکھنؤ ، دبستان عظیم آباد، اردو ادب کی آبیاری ہوئی تھی، اسی طرح ریاست رامپور نے بھی اردو ادب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اس دبستان کی خصوصیت یہ تھی، کہ یہ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کا سنگم مانا جاتا تھا۔ اس میں مشکل پسندی آسان پسندی دونوں طرح کی سخن آزمائی کی جارہی تھی۔ اس کے باوجود دبستان رامپور کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے۔ کہ شاعروں کو مشکل پسندی اور آسان پسندی کے بیچ کا راستہ اختیار کروانے میں اس دبستان کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے اس دبستان رامپور کی زبان میں سادگی کے ساتھ رنگینی ورعنائی موجود تھی۔ ان چیزوں پر سیر حاصل مقالے میں بحث کی گئی ہے۔ جو کہ حتمی نہیں ہوسکتی تاہم اس کی تحقیق وتنقید میں طمانیت کو برتا گیا ہے

باب دوم۔ نظامؔ رام پوری کی سوانح حیات

اس باب، میں سوانح حیات کے ساتھ ان کی پیدائش مع خاندان اور تعلیم وتربیت سے متعلق معلومات کو درج کیا گیا ہے۔ نظامؔ رامپوری کی پیدائش 1823ء میں ہوئی ان کے والد کا نام سید احمد شاہ تھا۔ نظامؔ رامپوری کا اصل نام سید

نظام شاہ تھا۔انہوں نے ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر حاصل کی اور کچھ بڑے ہوے تو مسجد میں عربی و فارسی اور اردو کی کتابیں پڑھیں۔ پھر وہ رامپور کی جامعہ مسجد مدرسہ جو مکتبہ رامپور کے نام سے مشہور ہے۔اس میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی شاعری کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ یہ کلاسیکی دور کے ان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اچھی خاصی شاعری کی ہے ان کی کلیات ،کلیات نظاؔم، کے نام سے منظر عام پر آچکی ہے۔اس میں دوسو سے زائد غزلیں اور قصائد ہیں۔ان کے استادوں میں شیخ علی بخش بیمؔار اور نواب رام پور، یوسف علی خان ناظؔم مشہور ہیں۔

باب سوم: میں نظام رامپوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔نظام رامپوری دبستان رامپور چنندہ شاعروں میں سے تھے۔ان کی شاعری میں تغزل، معاملہ بندی، اور تصوف کے ساتھ عشق حقیقی وعشق مجازی پنہاں ہے۔

تغزل : غزلیہ شاعری کو کہتے ہیں،جس میں غزل کے لوازمات کے ساتھ عشق و عاشقی روداد پنہاں ہوتی یہ چیزیں نظام کی شاعری میں ملتی ہیں۔

معاملہ بندی: جس میں نجی واقعات کا بیان شاعر رمزات کے ساتھ کرتا ہے۔اردو ادب میں معاملہ بند شعراء کے یہاں اکثر عریاں مضامین وصل کی خواہشات وآرزو پائے جاتے ہیں۔نظام رامھوری کے یہاں بھی اس طرح کی شاعری موجود ہے جس میں عریاں مضامین اور نجی واقعات پیوست ہیں۔مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جس میں یہ چیزیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ایسے کو شب وصل لگائے کوئی کیا ہاتھ
ہر بار جھٹک کر جو کہے ٹوٹے تیرا ہاتھ
اس دست نگاریں کو ذرا میں نے چھوا تھا
کس ناز سے کہنے لگے اف چھوڑ، گیا ہاتھ

تصوف: اردو شاعری میں بہت رچی بسی ہے۔جس کے اندر شاعری ایسے واقعات کو پیش کرتا ہے۔جس میں دنیا کی رنگینی و بے ثباتی کو اجاگر کیا جاتا ہے۔اور خود شاعر دنیا و مافیھا سے الگ ہوکر صرف اللہ کی یاد میں محو رہتا ہے۔نظام نے بھی اپنی شاعری میں تصوف کو برتا ہے۔ یہ ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے اپنے آپ کو دولت و دنیا کی

چمک سے دور رکھا ہے۔

دولت فقر ہے آل شہ جیلاں ہوں
نظام کیا غرض اس سے میرے ہاتھ میں ذر ہو کہ نہ ہو

عشق مجازی: جس کے اندر دنیاوی محبوب و معشوق کی محبت کی روداد ہوتی ہے نظام رام پوری کی شاعری میں عشق مجازی کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔

جھپکی الٰہی آنکھ کہیں اضطراب میں
جا گے میرے نصیب جو وہ آئے خواب میں

عشق حقیقی: اس سے اصل محبت، محبت الٰہی مراد ہوتی ہے، جس میں شاعر اللہ کی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ نظام رامپوری نے بھی ایسے اشعار لکھے ہیں جس میں عش حقیقی موجود ہے۔

اور اب کیا کہیں کہ کیا ہیں ہم
آپ ہی اپنا مدعا ہیں ہم
ایسے عاشق ہیں اپنے وارفتہ
آپ ہی اپنے دل رہا ہی ہے ہم
عشق جو دل میں درد ہوکے رہا
خود اسی درد کی دوا ہیں ہم

دہلی و لکھنؤ کے دبستان کی ممیّزات ان کی شاعری کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ یہ اردو کے معاصر اور بڑے شعراء کی روش پر چلے ہیں۔ جن میں ولؔی، میرؔ، دردؔ، غالبؔ ہیں۔ نظاؔم رامپوری کی غزلوں میں عشقیہ جزبات کی کثرت کے ساتھ ہجر وصال مایوسی کو بڑی ہنرمندی اور متاثر انداز میں پرویا گیا ہے۔ نظاؔم رامپوری کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے۔ کہ انہوں نے غزل کو ایک دائرے میں رکھا ہے۔ جس میں عشق و عاشقی اور محبت کے ساتھ دلی کیفیت کا بیان ہے۔ اور زندگی کے تصادمات اور کشمکش، بھی موجود ہے۔ عشق کی ناکامی پر آہ وفضا کرنا، ملال وشکوہ کرنا ان کی اکثر غزلوں میں موجود ہے۔ جس میں عاشق کی بے توجہی معشوق کی شدت محبت ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں

میں بہترین الفاظ اور اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ صنائع و بدائع کے ذریعے انہوں نے اپنی شاعری کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ جس میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، تجنیس، تضاد، تلمیح وغیرہ صنائع و بدائع کا استعمال بھی انہوں نے کیا ہے۔

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں
کیا منہ پر اس نے رکھ لیے آنکھیں چرا کے ہاتھ

مجموعی طور پر نظامؔ رامپوری کلاسیکی دور کے ایسے شاعر تھے۔ جو کچھ حد تک اردو ادب میں گم نامی کی زندگی جیئے لیکن ان پر ادیبوں اور ناقدوں، نے بہت کچھ تو نہیں لکھا ہے۔ لیکن کہیں کہیں امیر مینائی، نیاز فتح پوری وغیرہ کی تحریروں میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ بعد کے محققین میں جمیل جالبی وغیرہ نے ان کی سوانحی کوائف کو پیش کیا ہے۔ یہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں یک رنگی پائی جاتی ہے۔

باب کے آخر میں ماحصل ہے۔ جس میں نظام رامپوری کے فکر و فن کا محاکمہ پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری کی انفرادیت اور ممیّزات پیش کیا گیا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے نظام رام پوری اردو شاعری میں کیا حیثیت و اہمیت رکھتے تھے۔

مقالے کی تکمیل صرف ریسرچ اسکالر سے ممکن نہیں ہے۔ اس میں نگراں کی رہنمائی اور اساتذہ کرام اور دوستوں اور احباب کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس سے مقالہ پایا تکمیل کو پہنچتا ہے۔ مشفق نگراں ڈاکٹر اے۔ آر منظر صاحب، کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے دوران تحقیق میری اچھے سے مدد کی اور مجھے مفید مشوروں سے نوازا، اور حوصلہ افزائی کے ساتھ میری اصلاح بھی کی میں صدر شعبہ اردو پروفیسر سید فضل اللہ مکرم اور، دیگر اساتذہ کرام کا شکر گزار ہوں جنہوں نے دوران تحقیق میری مدد کی اور مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔

شعبہ کے دفتری عملہ کا بھی شکر گزار ہوں، کہ جنہوں نے میرے آفس کے کاموں میں مدد کی، اور تحقیق کے درمیان میں نے جن لائبریریوں سے مدد لی ان کے ذمہ داران کا بھی بے حد شکر گزار ہوں گے، اور صولت پبلک لائبریری رامپور کے صدر خصوصا ڈاکٹر محمود علی خاں، لائبریرین مسلم غازی صاحب، وکنسلٹینٹ ساحل منظور صاحب کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ہر طریقے کی مدد کی۔

رضا لائبریری کے صدر ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی جنہوں نے مجھے لائبریری سے استفادہ کرنے کی اجازت دی آخر

میں اپنے والدین کا احسان منداور شکر گزار ہوں کہ جن کی دعاؤں اور قربانیوں، کے سبب میں یہاں تک پہنچا اوران کی محنت وحوصلہ افزائی سے اپنے مقالے کو پائے تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ساتھ ہی ساتھ میں اپنی اہلیہ محترمہ شبانہ بھی کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میرا ہر طریقے سے خیال رکھا اور دوران تحقیق میری بہت حوصلہ افزائی کرتی رہیں اور اپنے بھائی بہنوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ہر طریقے سے قدم قدم پر ساتھ دیا۔اورخصوصی اپنے بڑے بھائی محمد عمر کا میں تہ دل سے شکر گزار ہوں،مولوی عبدالباسط ندوی صاحب کا جنہوں نے بچپن سے لیکر آج تک پڑھائی کے معاملے میں رہنمائی کی۔میں اپنے دوست احباب میں ڈاکٹر اطیع اللہ، ڈاکٹر زنیرہ صاحبہ،عبدالرزاق ،خوشبو پروین، اظہر جمال ،قمر احمد، جمال الدین،اجیت آریہ،وغیرہ کا شکر گزار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً تحقیق کے دوران میری مدد کی۔

تاریخ:۔۔۔۔۔۔۔۔۔

محمد یعقوب
ایم۔فل ریسرچ اسکالر
یونیورسٹی آف حیدرآباد

باب اول: دبستان رامپور

(الف)　　ریاست رامپور کی مختصر تاریخ

شہر رامپور ضلع رامپور کا صدر مقام ہے، یہی وہ ضلع ہے جو ریاست رام پور کے نام سے انتہائی عظمت واہمیت کا حامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ضلع کی آبادی سے قبل یہاں ''رمپورہ'' نام کا ایک گاؤں تھا۔ جس کے نام پر اس ریاست کا نام رامپور پڑا۔ مرتضیٰ ساحل تسلیمی رامپور کی تاریخی حیثیت کو کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

> ''رامپور صوبہ اتر پردیش کا رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے اگر چہ ایک چھوٹا ضلع ہے لیکن اپنی تاریخی سیاسی اور علمی حیثیت کی وجہ سے ہمیشہ انتہائی عظمت واہمیت کا حامل رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آبادی سے قبل یہ رمپورہ نام کا ایک گاؤں تھا اسی لیے جب یہاں شہر بسایا گیا تو اس کا نام رامپور ہو گیا۔ تاریخ کی کتب میں اسے بسانے والے صاحبزادہ مصطفیٰ علی خان کے نام کی رعایت سے اسے مصطفیٰ باد کہا گیا، مگر یہ کچھ عرصہ تک سرکاری کاغذات کی حد تک ہی رہا۔''[1]

اس ضلع کے شمال میں اتراکھنڈ کا ضلع ادھم سنگھ نگر، مغرب میں مرادآباد، مشرق میں بریلی، اور جنوب میں بدایوں، ہے۔ یہاں کی زمین ہموار ہیں، اور زرخیز ہے۔ آبپاشی کے انتظام اچھے ہیں۔ کئی نہریں ضلع میں کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں۔ نوابوں کے دور کی پرانی نہریں بھی اس شہر کے کھیتوں کی آبپاشی کرتی ہیں۔ رام پور کی مشہور ندی رام گنگا، گاگن ندی، ناہل ندی، اور پیلا خار، وغیرہ ہیں ان کے علاوہ چھوٹی ندیاں ہیں، جس میں بھکڑا، ڈکرا، کچ گیا، دھیری، جوٹھے وغیرہ ہیں رامپور کی کل آبادی موجودہ دور میں 2723819 ہے۔ اس کا رقبہ 2367 مربع کلومیٹر میں ہے۔

ضلع میں کل چھ تحصیلیں ہیں۔ضلع رامپور کے شہر میں داخل ہونے اور باہر جانے کے لیےکئی دروازے تھے۔جس میں چند ایک کا پتہ آج بھی نہیں چلتا ہے،لیکن آج بھی یہ دروازہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔نواب دروازہ، بلاسپور دروازہ،عیدگاہ دروازہ، ڈوگر پورہ، دروازہ موری، دروازہ دہلی دروازہ،سرائے دروازہ، یہ دروازے آج بھی موجود ہیں۔ جہاں سے دوسرے شہروں میں جانے کے لئے سواریاں ملتی ہیں۔

رامپورریاست کی اگرتاریخ کی بات کی جائے تو تقریباپانچ ہزارسال پرانی تاریخ ہے، جواس ریاست سے جڑی ہوئی ہے۔تین ہزارقبل مسیح ایک ہندوراجہ سروانے دریائے گنگا کے کنارے سیفنی گاؤں کے پاس قلعہ تعمیر کراکر اپنااقتدارمضبوط کیا۔قلعہ شیوپوری دیہات میں آج بھی موجود ہےاس راجہ کاتعلق گوجر سے تھا یہیں سے ریاست رام پور کا کی تاریخ کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔مگراس کی باقاعدہ تاریخ کشتوریوں کےعروج سے ہوئی جنہوں نے یہاں کا قلعہ تعمیر کرایا جس میں روہیلوں کا قبضہ ہوااورنواب بھی اس قلعہ کواپنے قبضے میں لیے۔ یہاں ترکوں کی دہلی آمد کے ساتھ یہ ترک سلاطین رامپور کی ریاست میں بھی آچکے تھے۔اورروہیلوں کی آمد سے یہاں پر پٹھانوں کی آبادی تیز ہوئی پہلے آبادی بلاسپور میں زیادہ ہوئی۔اسی طرح احمد شاہ ابدالی کی فوج کے ساتھ ترک لوگ بھی جگہ جگہ رام پور میں آباد ہوگئے تھے۔جس میں نواب فیض اللہ خان نے اس شہر میں اپنی رہائش گاہ کا قیام کیا پھر یہیں سے نوابوں کا سلسلہ اس ریاست میں چل پڑااوراس ریاست کے پہلے نواب نواب فیض اللہ خان تھے۔

نواب فیض اللہ خان:

ریاست رامپور کے اولین نوابوں میں ان کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے، یہ اس ریاست کے بانی اور پہلے بادشاہ تھے۔ان کی ولادت 1733ء میں ہوئی۔نواب فیض اللہ خان نیک صالح اورعلم دوست بہادراورملن سازآدمی تھے۔رامپور کے جس حصے پران کی حکمرانی تھی اس کی ترقی کے لئے یہ ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔نواب فیض اللہ خان نیک صالح اورعلم دوست انسان تھے۔لڑائی اور جنگ وجدال سے خودکودور رکھتے تھے۔علماءفضلا اورصوفیاءکرام کواپنے

یہاں اکٹھا کرتے تھے۔دنیاوی اور مذہبی باتیں ان سے سیکھتے تھے اور ان کے ساتھ عزت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔علماء صوفیاء کے لیے وظیفے بھی مقرر کیے تھے عالموں کی ان کے نزدیک بہت عزت تھی ان کے دربار میں علماء بغیر اجازت آتے جاتے تھے۔ساتھ ہی یہ قومی یکجہتی کو بھی بڑھاوا دینے میں لگے رہتے تھے۔شبیر علی خاں شکیب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''نواب فیض اللہ خان باپ کی طرح سپاہی منش دیندار اور مدبر تھے۔انہوں نے رام پور کو اپنے حسن انتظام اور روہیلوں کی دلجوئی کر کے پورے روہیل کھنڈ میں واحد دارالامن بنادیا۔قرب وجوار کے پٹھان اور دوسری قوموں اور مذاہب کے لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے۔علماء اور صوفیاء کے بے حد قدر دان تھے یہی سبب تھا کہ بقول منو لال رام پور میں تقریباً پانچ سو علماء کرام جمع ہو گئے جن کو ریاست سے مشاہرہ ملتا تھا اور ایجازت تھی کہ وہ سرکاری مدرسے میں پڑھائیں یا اپنے گھر پر طلبہ کو تعلیم دیں اسی طرح ان کی دینداری اور صوفیاء کی قدردانی کی بنا پر متعدد بزرگ مثلاً حافظ شاہ جمال اللہ شاہ درگاہی شاہ بغدادی جمال الدین وغیرہ رامپور آ گئے آج بھی ان کے مزارات مرجع خلائق ہیں۔نواب موصوف نے تقریباً بیس برس نہایت شان سے حکومت کی اور ریاست کی معمولی سی آمدنی کو عوام کی فلاح و بہبود پر صرف کیا ان کے دو کام خاص طور پر یاد رکھے جائیں گے ایک مدرسہ (سرکاری موجودہ مدرسہ عالیہ) کا قیام اور دوسرا سرکاری کتب خانہ جو آگے چل کر رضا لائبریری رامپور کے نام سے مشہور ہوا اور آج اس کی بنا پر رامپور کی شہرت ہے۔''[۲]

ان کے گھرانے میں علم وادب خوب پھلا پھولا، ان کے بھائی نواب محمد یار خان کو شاعری سے بہت دلچسپی تھی ،ساتھ ہی نواب فیض اللہ خان کے دور میں دیگر ریاست کے ادباء وشعراء رامپور تشریف لاتے تھے، جس میں میر سوز اور قدرت اللہ شوقؔ کا نام قابل ذکر ہے نواب فیض اللہ خان علم وادب کے دلدادہ تھے۔اوران کی وجہ سے ریاست رام پور میں اردو ادب کی خوب آبیاری ہوئی۔انہوں نے رامپور کو بلندیوں تک پہنچایا۔ان کی وفات 1794ء میں ہوئی ان کا مقبرہ رامپور میں رضا ڈگری کالج کے قریب ہے۔

نواب غلام محمد خاں:

نواب غلام محمد خان ریاست رام پور کے ان حکمرانوں میں سے تھے، جو ریاست رام پور کو اختلاف جنگ و جدال سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوئے ان کی پیدائش 1762ء میں ہوئی جو نواب فیض اللہ خان کے دوسرے بیٹے تھے۔اپنے بڑے بھائی کے قتل کے بعد 1794ء میں تخت نشیں ہوئے۔لیکن جس طرح یہ جنگ و جدال سے بچتے رہے، پھر بھی دشمنوں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا وہ اپنے بیوی بچوں اور کچھ سپاہیوں کو لے کر یہ پہاڑی پر چلیع گئے، اور وہاں انہوں نے اپنا پناہ گاہ بنا لیا، بعد میں یہ پہاڑی کٹھیر کے نام سے مشہور ہو گئی۔آصف الدولہ اور انگریزوں کی فوج اس پہاڑ پر پہنچ گئی، پھر کئی حملے کیے لیکن ان کی رسائی نواب غلام محمد خان تک نہ ہو پائی، پھر آصف الدولہ اور انگریزوں کے ذریعے ان کو پیغام پہنچایا گیا، کہ روہیلو میں ایک مہاماری پھیلی ہے، جس سے وہاں کے لوگ بیمار ہو رہے ہیں، تب نواب غلام نواب آصف الدولہ کے کیمپ میں آئے اور صلح کی۔وہ بنارس کے لیے روانہ ہوئے ،اور بنارس سے حج کے لئے کلکتہ روانہ ہوئے۔اور اپنے فوجیوں کو یہ مشورہ دیا کہ جہاں تک تم سے ہو سکے وہیں لوگوں کی مدد کرنا، اور ان کا ساتھ دینا، عوام کی قتل و غارت کی ڈر سے ہی انہوں نے نواب آصف الدولہ سے صلح کیا۔ڈاکٹر رخسانہ عالم اپنی کتاب رام پور میں شعری روایت اور نظام رامپوری میں لکھتی ہیں۔

> ''نواب غلام محمد خان کو مجبور کر کے میدان جنگ سے رامپور لایا گیا اور یہاں سے بیوی بچوں اور سپاہیوں اور شہریوں کو لے کر وہ پہاڑ پر چلے گئے ،اور اس جگہ کو ریہڑ لکھا گیا ہے، لال ڈونگ میں پناہ لینا درست نہیں ہے۔آصف الدولہ اور انگریزوں کی افواج بھی وہاں پہنچ گئیں۔کئی حملے کیے گئے لیکن قابو نہ پایا جا سکا دونوں حریف اس صورت حال سے تنگ آ چکے تھے، آصف الدولہ اور انگریزوں کے پیام آتے رہے ادھر روہیلوں میں ناموافق آب و ہوا سے بیماری پھیل گئی اور اسہال اور تپ لرزہ کی وجہ سے ہزاروں آدمی بیمار ہو کر مرنے لگے،نواب غلام محمد خان آصف الدولہ کے کیمپ میں پہنچ گئے، اور ان کو بنارس بھیج دیا گیا۔نواب نصر اللہ خان سلطان نے ۱۷۹۴ کو آصف الدولہ سے عہد نامہ کر لیا احمد علی خاں کو نوابی طے ہوئی اور باوجہ صغیر سنی نواب نصر اللہ خان کو نائب

ریاست مقرر کیا گیا اس طرح نواب غلام محمد خان کا زمانہ حکومت ۱۳ محرم سے 5 جمادی الاولیٰ یعنی تین مہینے اور بائیس دن رہا نواب غلام محمد خان حج کرنے کے لیے بنارس سے براہ راست کلکتہ روانہ ہو گئے۔''[۳]

نواب محمد سعید خان:

یہ غلام محمد خان کے بیٹے تھے، ان کی پیدائش 1786ء میں ہوئی۔1840ء میں تخت نشیں ہوئے، اور جب ریاست رام پور کے حکمران ہوئے۔تو لوگوں میں یہ بات پھیلی کہ یہ ریاست کے حاکم بننے کے مستحق نہیں ہیں۔کیونکہ ان سے پہلے نواب احمد علی خاں کی ایک لڑکی تھی۔لیکن نواب محمد سعید خان کے چاہنے والوں نے خاص کر پٹھانوں نے اس لڑکی کو حاکم نہ بننے دیا، کیونکہ ان لوگوں کا ماننا تھا لڑکی نوابیت کی کرسی پر نہیں بیٹھ سکتی۔اس بنا پر نواب محمد سعید خان کو سنہرا موقع حاصل ہوا جب ان کا دور حکومت آیا تو رامپور کی حالت یہ تھی کہ یہاں کی حکومت میں انگریزوں کی دخل اندازی زیادہ ہونے لگی تھی۔رامپور کے یہ ایسے نواب تھے جنہوں نے ریاست میں جدید ترقیاتی عمل کی ابتدا کی، ریاست کے قدیم طریقوں کو ختم کر کے،فوج، و دیگر محکمات میں نئے طریقے ایجاد کئے اور از سر نو تنظیموں کا قیام کیا۔جس کی وجہ سے رام پور میں ایک نئی فضا قائم ہو سکی اقتصادی سماجی معاملات میں تبدیلیاں رونما ہوئیں، آمدنی میں اضافہ ہوا ریاست کے ہر خطے میں امن وامان ہونے لگا رعایا خوش رہنے لگی،نواب سعید خان نے ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو علم وادب سے بھی جوڑے رکھا اور علماء وادباء کو ریاست کے عہدوں پر بھی فائز کیا۔

سعود الحسن خان روہیلہ اپنی کتاب میں ان کے تعلق سے کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''حقیقت حال یہ ہے کہ نواب بننے سے قبل محمد سعید خان بدایوں میں کلکٹر تھے۔اسی وجہ سے اس کو انتظامیہ و مالیات پر دسترس حاصل تھی۔نواب بننے کے بعد انہوں نے ہی قواعد، وضوابط کے تحت ریاست کا انتظام کیا، اور امن وامان قائم کیا بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے۔کہ جدید رامپور کی بنیاد نواب محمد سعید خان نے رکھی اس کے دور میں اکثر خام عمارتوں کو پختہ کیا گیا،انہوں نے رامپور کے بازاروں کو پختہ کروایا دوکانوں کی چھتیں بلند کروائیں۔سائبان ختم کروا دیے سڑکیں درست کروائیں اور کچرے کے سد باب کا انتظام کیا۔''[۴]

نواب یوسف علی خان ناظم:

نواب سعید خان کے لڑکے تھے، ان کی پیدائش 1816ء میں رامپور میں ہوئی۔ 1855ء میں انہوں نے ریاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی، والد کے انتقال کے بعد ولی عہدی ملنے پر یہ ریاست کو ترقی کی راہ پر لے جانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اس لئے نئے طریقے اختیار کیے اس میں انگریزوں کے ساتھ مل کر ان کی مدد و تعاون سے ریاست کو بلندی تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ یوسف علی خاں کے دور میں فوج میں کچھ لوگوں نے باغیانہ طریقہ اختیار کیا۔ جس میں بخت خاں وغیرہ شامل ہیں اور یہ لوگ نواب یوسف علی خاں کی تخت نشینی کو چھیننا چاہتے تھے۔ لیکن نواب یوسف علی خاں اپنی عقل مندی اور خوش مندی سے ان تمام حاسدوں کا مقابلہ کیا۔ اور ریاست رامپور کو جنگ وجدال سے بچایا، اپنے باغیوں اور دشمنوں کو اپنا مطیع بنایا۔ نواب یوسف علی خاں کی تعلیم و تربیت ان کے والدین کی نگرانی میں گھر پر ہوئی، اسی تعلیم و تربیت کے عوض یوسف علی خاں کو علم سے رغبت پیدا ہوئی شعر و شاعری کی طرف میلان ان کا فطری تھا، ان کے عہد میں ریاست کے تقریباً ہر خطے میں شعر و شاعری اور مشاعروں کی محفلیں سجتی تھیں، اس میں ایک وجہ یہ بھی ذکر کی جاتی ہے۔ کہ نواب یوسف علی خاں شعراء اور ادباء کی مالی مدد بھی کرتے تھے۔ جس کی بنا پر دوسری جگہوں کے شعرا کی رام پور کی طرف خصوصی توجہ کی جب 1857ء کی غدر میں شاعروں نے دہلی ترک کر کے الگ الگ جگہوں کو جا رہے تھے، تب رام پور کے نواب یوسف علی خان نے ادباء شعراء کو اپنی ریاست میں پناہ دی، ساتھ ہی ان کی عزت و تکریم بھی کیا کی۔ اس کے علاوہ ادباء شعراء کے ماہانہ وظائف بھی مقرر کیئے، نواب یوسف علی خاں کے دور میں ریاست رامپور کو ادبا و شعرا نے اپنی اپنی تخلیقات سے بہترین سرمایہ دیا۔ جس کی بنا پر دبستان رام پور خوب پھلا پھولا اس وقت رامپور میں الگ الگ علوم کی تعلیم دی جا رہی تھی، جس میں فارسی، عربی، فلسفہ خوشنویسی شامل ہے۔ خود نواب یوسف علی خاں ناظم اپنے دور کے اچھے شاعر اور ادیب تھے شاعری میں رموز و، اوقاف سے اچھی واقفیت رکھتے، ان کی استاد مومن خان مومنؔ تھے مومن کے انتقال کے بعد غالبؔ جیسے بڑے شاعر کی شاگردی اختیار

کی ،ساتھ ہی شاعری میں انہوں نے جو تخلص اختیار کیا اس میں یوسفؔ اور ناظمؔ دونوں ہے۔ جناب شبیر علی خان شکیبؔ اپنے کتاب رام پور کا دبستان شاعری میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شاعری میں مومن خاں مومن کی شاگردی اختیار کی ابتدا میں یوسف تخلص تھا ۱۸۵۷ میں جب مومن کا انتقال ہو چکا تھا۔ غالب کی شاگرد ہوگئے اور ان کے مشورے سے ناظم تخلص اختیار کیا۔ انہوں نے غالب کو خط لکھا تھا کہ اس سے پہلے انہوں نے مصرع تک نہیں کہا ہے، کیونکہ بہت سا کلام جو غالب کو بغرض اصلاح بھیجا تھا وہ مومنؔ کا اصلاح شدہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت عمدہ مذاق شعری رکھتے تھے جہاں انہوں نے مومنؔ کے رنگ کو اختیار کیا تھا، غالب کے انداز سخن کو بھی خوب نبھایا، یہی سبب ہے کہ ہمارے بعض ناقدین نے ان کو شریک غالب سمجھ لیا تھا۔ غالب کے بعد جب ان کو لکھنوی رنگ سے سخن مرغوب ہوا تو اسیر لکھنوی کو کلام دکھایا۔ ناظم نے رام پور اکر یہاں طرحی مشاعروں کے سلسلے کا آغاز کیا۔ ناظم کی طرح ان کے کئی چچازاد بھائی بھی دلی میں مومن کے شاگرد ہو چکے تھے وہ بھی رام پور آ گئے ان میں صاحبزادہ عباس علی خاں بیتابؔ، صاحبزادہ عنایت علی خان عنایتؔ، صاحبزادہ ہدایت علی خاں غربتؔ، اور صاحبزادہ عبدالوہاب سروش کے نام قابل ذکر ہیں۔ مومن کے ان شاگردوں کے علاوہ حشمت خاں موجد رامپوری تسکین دہلوی اور ان کے فرزند میر عبداللہ غمگین کو بھی رامپور طلب کر لیا گیا اس طرح کے ماحول شعر و سخن پر مومن کے رنگ کا بھی خاصہ اثر پڑا۔''۵

نواب یوسف علی خان ہندوستان کے ان حکمرانوں کی فہرست میں شامل ہیں ،جن کی خدمت ریاست کے لئے کافی ہے۔ اور اپنی حکمت عملی سے اپنے باغیوں کو زیر کیا اور دوراندیشی سے ان کاموں کو انجام دیا جن میں ظاہری طور پر نقصان دکھ رہا تھا۔لیکن اس میں ملک اور قوم کی مفاد تھی جیسے انگریزوں کی معاونتوں وغیرہ ہے، اس میں یوسف علی خان کی مجبوری اور دوراندیشی دونوں شامل ہیں۔ انگریزوں سے مفاہمت اس وجہ سے کر رہے تھے، اگر ان سے لڑائی کی جائے تو ہماری کمزوری کی وجہ سے ریاست اور قوم دونوں کا نقصان ہوگا۔ انگریزوں کی مدد سے انہوں نے کئی علاقوں کو اپنی ریاست میں شامل کیا ڈاکٹر رخسانہ عالم اپنی کتاب ''رام پور میں شعری روایت اور نظامؔ رامپوری'' میں لکھتی ہیں:

''آج نواب یوسف علی خاں کو ہندوستان کے ان حکمرانوں کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے باغیوں کا ساتھ نہیں دیا اور انگریزوں کے دوبارہ تسلط حاصل کرنے میں معاونت کی لیکن اگر غور کیا جائے، تو تصویر کا دوسرا رخ نواب موصوف کی صفائی میں پیش کیا جاتا ہے اور اس سے ان کی مجبوری اور دور اندیشی دونوں ثابت ہوتی ہیں سب سے پہلے یہ امر ملحوظ رکھنا ہوگا، کہ جنگ دوجوڑہ یعنی 1794ء کے بعد ریاست رامپور حکومت اور بعد ازاں انگریزوں کے زیر تسلط آ گئی تھی اور 1840ء میں نواب احمد علی خان کی وفات کے بعد ان کی تنہا وارث شمسہ بیگم کو جب پٹھانوں نے مسند نشیں ہونے سے اتفاق نہیں کیا۔ تو انگریزوں نے محمد سعید خان خلف نواب غلام محمد خان کو رامپور کی نوابی عطا کی جو اس وقت بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان سے ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے انہیں انگریزوں کی بالادستی تسلیم کرنا پڑی اور ان کا اقتدار انگریزوں کے ساتھ وفاداری برتنے پر منحصر ہو گیا جس پر انہوں نے تاعمر عمل کیا اور مرنے سے قبل بیٹے کو جو وصیت کی اس میں بھی گورنمنٹ اور حکام انگلشیہ کی اطاعت اور دوستی کی تلقین کی گئی نواب یوسف علی خاں کو لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی اور شمالی نے مسلمان نشین کیا تھا اور وہ مدد کرنے پر مجبور تھے۔ دوسری بڑی وجہ ایک اور تھی، جس سے عام طور پر لوگ واقف نہیں بریلی میں باغیوں کی زبردست جماعت اکٹھا ہوگئی تھی۔ رامپور کے سیکڑوں پٹھان خود جا کر شامل ہو گئے تھے خان بہادر خان نبیرہ حافظ رحمت خان نے اپنی نوابی کا اعلان کر دیا تھا۔ اور جنرل بخت خان باغیوں کی کثیر جماعت کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ کیونکہ ان سب کی نظر میں نواب یوسف علی خاں انگریزوں کے وفادار تھے یہ طے پایا کہ رامپور پر حملہ کر کے ان کی جگہ شمسہ تاجدار بیگم کو مسند نشین کر دیا جائے جو دعوے دار تھے ریاست تھی لیکن ان امور کے علاوہ بعض مصلحتیں اور بھی تھی یعنی نواب موصوف نے اپنی ذہانت اور دور اندیشی کی بنا پر یہ سمجھ لیا تھا کہ باغیوں میں حد سے زیادہ جوش و خروش تو ضرور ہے۔ لیکن نہ تو ان میں نظم و ضبط ہے اور نہ ہی جنگی صلاحیت اور نہ عملی طور پر کسی قائد کی اطاعت کو تسلیم کرتے ہیں۔ طوائف الملوکی اور لوٹ مار ان کا مطمح نظر ہے دوسرے پنجاب کے سکھ اور پہاڑی گورکھے ان باغیوں کے بجائے انگریزوں کا ساتھ دیں گے اس لیے انہوں نے طے کیا کہ خود اپنی ریاست کے علاوہ ضلع مرادآباد کا اپنی فوج کے ذریعے انتظام سنبھال لیا جائے۔''[۶]

ان کی وفات 21 اپریل 1865ء کو 50 سال کی عمر میں ہوئی ان کا مقبرہ رضا لائبریری کے پاس میں ہیں۔

نواب کلب علی خاں:

نواب کلب علی خاں ان کی پیدائش 19 اپریل 1840ء میں ہوئی تھی یہ ایک خالص مذہبی انسان تھے اپنے باپ کی طرح ریاست کے لوگوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے، والد کے انتقال کے بعد ۱۸۸۵ء میں ولی عہد مقرر ہوئے۔علم وادب سے ان کا خاص لگاؤ تھا۔ان کے استادوں میں مولوی غیاث الدین، مولوی فضل حق خیرآبادی، اور شمس الحق خیر آبادی وغیرہ ہیں۔جن سے انہوں نے مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی شاعری ادب اور موسیقی، فقہ وغیرہ پر عبور رکھتے تھے۔خود علماء وادباء شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے۔اور علماء کو سرکاری ملازم کی حیثیت سے عہدے بھی نوازے۔ شاعری اور موسیقیت سے بہت اچھی واقفیت تھی۔نواب کلب علی خاں نے شاعری میں امیر مینائی سے اصلاح لی ۔میلے اور جلوس وغیرہ کے اہتمام کا انہیں بہت شوق تھا۔عقیدے کے لحاظ سے نواب کلب علی خان سنی مذہب کے پابند رہے۔۔اس کے ساتھ فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، جناب مسعود الحسن خاں روہیلہ اپنی کتاب رام پور تاریخ اور ادب میں نواب کلب علی خاں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''نواب کلب علی خاں 1886ء میں مسند نشین ہوا اس کے عہد کے آغاز میں ہی میں ایک میلے کی ابتدا کر دی گئی جسے میلہ بے نظیر کہا جاتا تھا۔ یہ میلہ روہیلکھنڈ کے امراء کے لیے لگایا مخصوص تھا۔جس سے اس دور کی طبقہ بندی کی نشاندہی ہوتی ہے 1866ء میں نواب کلب علی خاں کو گورنر جنرل کی لجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا اسی طرح سے انگریزی حکومت کی جانب سے نواب کو مناسب ومراتب ملتے رہتے تھے، 1886ء میں مشتاق علی خاں ولد کلب علی خاں کو ولی عہد مقرر کیا گیا کلب علی خاں کے دور میں کوتوال تین ماہ تک قید کی سزا دے سکتا تھا۔اور خفیہ رقم کے دیوانی مقدمات کی سماعت کر سکتا تھا۔تحصیلدار اپنی تحصیل کے اندر منقولہ جائیداد کے دیوانی مقدمات سماعت کر سکتے تھے البتہ غیر منقولہ جائیداد کے دیوانی مقدمات نہ سن سکتے مفتی دیوانی یا سول جج کو تمام دیوانی مقدمات سننے کا اختیار تھا۔مفتی مرافعہ دیوانی مقدمات کی اپیل کی سماعت کرتا تھا صدر مرافعہ دیوانی نوعیت کی کی اعلیٰ عدالت تھی فوجداری کو تمام اختیارات حاصل تھے۔کہ وہ ان فوجداری مقدمات کی سماعت کرے جن میں تین سال تک کی سزا ہو، حاکم رعایا کو سخت سزائیں دینے کا اختیار تھا۔صدر منافع کو کل اختیارات فوجداری تھے۔صدر مرافعہ کا عہدہ نواب کے پاس ہوتا تھا۔خواہ مقدمہ دیوانی ہو یا فوجداری ہو دیوانی مقدمات پر اسٹام ڈیوٹی نہ تھی۔انگریزی قانون

عام طور پر رائج نہ تھا دیوانی حکام علماء میں سے مقرر ہوتے تھے فوجداری کا حاکم بننے کے لیے عالم ہونے کی شرط نہیں تھی محکمہ صدر میں عدالتی خط وکتابت کا کام کاج ہوتا تھا۔'' ے

انھوں نے اپنے انتظامی دور میں ریاست میں ترقی کے بہت سے کام کروائے جس سے ریاست کے کام کاج میں آسانی ہوئی جیسے آبپاشی کے محکمہ کا قیام عمل میں لانا اور عدالتی احکامات وغیرہ کے ساتھ فوج میں بھی الگ الگ عہدے مقرر کیے، ان عہدوں پر الگ الگ افسران کو مقرر کیا، ساتھ میں علاقے میں تھانہ، کچہری، وغیرہ کا قیام عمل میں لائے۔ ان کی وفات 23 مارچ 1877ء میں ہوئی۔

نواب مشتاق علی خان:

ان کی پیدائش 23 مارچ 1857ء میں ہوئی۔ نواب کلب علی خاں کے بیٹے تھے والد کے انتقال کے تیسرے دن یعنی 1877 میں تخت نشیں ہوئے، ان کی تعلیم وتربیت مدارس میں ہوئی، مدارس میں انہوں نے ریاضی کے ساتھ دیگر علوم وفنون پڑھا۔ انھیں کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں 300 سے زائد کتابیں موجود تھیں۔ علم وادب سے شغف رکھنے کے ساتھ ساتھ ریاست کی تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے۔ اپنے عہد میں انہوں نے الگ الگ کاموں کا آغاز کروایا ریاست میں نئی نئی چیزیں پیدا ہوئیں، جیسے شراب کا ٹھیکہ کا باقاعدہ جاری ان کے دور میں ہوا۔ اور انہوں نے کچہری کے کام کے لیے اوقات کا متعین کیا۔ ہندوؤں کی ذاتوں کے لیے پنچایت بنائی۔ جس سے تنازعات کا حل کیا جاسکے پولیس محکمہ سپرنٹنڈنٹ عہدے کا اضافہ کیا گیا، فوج میں الگ الگ ٹکڑیوں کا نام دیا گیا، انگریزی مدارس قائم کئے گئے ہیں ان کے لئے خاص عملا کو مقرر کیا گیا جس کی وجہ سے ریاست رام پور ترقیوں کی اونچائی کو پہنچتی رہی، لوگوں کے لئے وظیفہ کا انتظام کیا گیا ساتھ میں صنعت وحرفت کے لیے انھوں نے سرکاری خزانے سے لوگوں کو پیسے دیے جس سے وہاں کے کاروبار میں اضافہ ہوا اور ریاست کی اقتصادی حالت میں درستگی ہوئی انہیں فالج کے ساتھ دوسری بیماریاں بھی تھی لیکن پھر بھی ریاست کا خیال رکھا۔ جس کی بنا پر صرف 32 سال کی عمر میں یعنی 25 فروری 1889ء میں فوت ہوگئے۔

سعود الحسن خان روہیلا اپنی کتاب ''رام پور۔۔۔ تاریخ وادب'' میں لکھتے ہیں:

''نواب مشتاق خاں 2 مارچ 1887ء مسند نشیں ہوئے۔ یہ معذور تھے، لہذا جنرل اعظم الدین

خان کو مدارالمہام ریاست مقرر کیا گیا۔اس کے دور میں شراب کا با قاعدہ ٹھیکا جاری ہوا علاقہ قدیم ریاست کے لئے اسٹامپ تجویز کیا گیا۔کچہری کے کام کے اوقات متعین کیے گئے۔مدارالمہام کی سربراہی میں مشاورتی کونسل قائم کی گئی،ہندوؤں کی چاروں ذات،برہمن،چھتری،ویش اور شودر سے ایک ایک رکن منتخب کر کے پنچایت بٹھائی گئی،جس کا کام ان کے خاندانی تنازعات کو حل کرنا تھا۔ستمبر 1888ء میں محتاج خانہ قایم کیا گیا۔پولیس میں سپرینڈنٹ کے عہدے کا اضافہ کیا گیا، دو کمپنیاں گورکھے فوجیوں کی قائم کی گئی،اور ایک جیل کمپنی بھی بنائی گئی۔اسی کے دور میں ریاستی بجٹ کا سلسلہ شروع کیا گیا انگریزی مدرسہ قائم کیا گیا۔شہر کی صفائی کے لیے خاص عملہ مقرر کیا گیا نواب مشتاق علی خان کے دور میں صیغہ مالگزاری میں تبدیلیاں کی گئی ہیں۔نواب مشتاق علی خان نے دفتری زبان فارسی سے بدل کر اردو کر دی،رام پور کے سرکاری و دفتری امور اردو میں طے پانے لگے۔ہجری کی جگہ سن عیسوی سرکاری دفاتر میں ہوگئی۔'' ۸؎

نواب حامد علی خاں:

ان کی پیدائش 1875 میں ہوئی،ان کے والد کا نام صفدر علی خان تھا،ان کی تعلیم و تربیت کے لیے انہیں نینی تال بھیجا گیا، جہاں سے انہوں نے مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی ،اور عربی کی تعلیم رامپور سے حاصل کی وہ شعروشاعری میں دلچسپی رکھتے ،اور رشکؔ اپنا تخلص اختیار کیا علم وادب میں دلچسپی کے ساتھ یہ ریاست کی ترقی کے لئے کوشاں تھے۔ان کے عہد میں عمارتے بنائی گئی ہیں۔اور جو عمارتیں پہلے سے موجود تھی۔ان عمارتوں کی صفائی ستھرائی کرائی گئی ،عمارتیں تعمیر کرانے کا نواب حامد علی خاں کو بہت شوق تھا۔ بہت سی مشہور عمارتیں ان کے دور میں بنائی گئی، ان میں سے کچھ عمارتیں یہ ہیں جیسے حامد منزل ،رضا لائبریری ، گیسٹ ہاوس رائبر گیٹ ،امام باڑہ رنگ محل ،قلعہ معلیٰ ، کوٹھی باغ ،اور مسجد مچھلی بھون ، وغیرہ ہیں فن تعمیر میں بھی نواب حامد علی خاں کو بہت عبور حاصل تھا۔ڈاکٹر رخسانہ عالم لکھتی ہیں۔

''نواب حامد علی خاں کے بالغ ہو جانے پر یکم جون 1896ء کو اختیارات کاملہ ملے اور کونسل توڑ دی گئی۔نواب صاحب کا 30 جون 1930ء کو انتقال ہوا۔انہوں نے اکتالیس برس نوابی کی نواب

موصوف کا مزاج شاہانہ تھا۔تعمیرات کا بے حد شوق تھا۔موجودہ قلعہ، جامع مسجد، امام باڑہ، مچھلی
بھون، حامد منزل، خاص باغ، اور شاہ آباد تحصیل کی شاندار عمارتیں ان کے عہد ہی میں تعمیر ہوئیں۔
ابتدائی دورِ حکومت میں شاعری کا شوق ہوا شاندار مشاعرے بھی کرائے اعلیٰ پیمانے پر ایک سرکاری
تھیٹر بھی قائم ہوا، لیکن بعد میں میل سرائیکی دلچسپیاں غالب آ گئیں بعد وفات جنازہ نجف اشرف
لے جایا گیا''۹

حامد علی خان کے آخری دور میں یہودیوں کا اثر ورسوخ زیادہ ہوا اور ریاست میں یہودیوں کے کانفرنس اور سیمینار عمل میں لائے گئے۔نواب خود اس کام میں دلچسپی لیتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یہودیوں کے ذریعے انجینئرنگ کے فرائض انجام دیے گئے ان کی وفات مارچ 1923 کو فالج کی بیماری کی وجہ سے ہوئی تھی۔

نواب رضا علی خاں:

ریاست رامپور کے آخری نواب تھے۔ان کی پیدائش 17 نومبر 1906ء کو ہوئی۔نواب حامد علی خان کی وفات کے بعد، نواب رضا علی خاں 24 سال کی عمر میں 30 جون 1930ء کو تخت نشین ہوئے، ذہین حکمران تھے۔ انہوں نے اپنے دور میں دینی وعصری تعلیم کو فروغ کے خاطر مدرسہ کے ساتھ کالج اسکولوں، کا قیام عمل میں لائے ،ساتھ میں عدلیہ کے انتظام میں درستگی کی رامپور میں ہائی کورٹ کا قیام کیا۔انہوں نے صنعت وحرفت کی ترقی میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی انہوں نے لوگوں کو ذریعہ معاش دینے کے لئے ریاست میں بڑے بڑے کارخانے کھولے گئے ،عوام میں سیاسی بیداری کے لیے انہوں نے الگ الگ تنظیمیں قائم کی، جو سیاسی تحریکات، کے اغراض ومقاصد سے لوگوں کو آگاہ کرواتی تھیں ان کے دور میں ریاست کے ہر شعبہ نے ترقی حاصل کی صنعتی تعلیمی اعتبار سے اس دور میں ریاست کو عروج حاصل ہوا، اور رضا ڈگری کالج کا قیام بھی انہی کے دور میں ہوا جس میں اردو کے مایہ ناز ناقد آل احمد سرور منسلک تھے۔خورشید ڈگری کالج کو نواب نے لڑکیوں کے لئے تعمیر کرایا تھا۔جس کی تعمیر 1932ء میں ہوئی یہ ریاست کا سب سے پہلا کالج تھا، جو لڑکیوں کے لئے خاص تھا۔اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ نواب رضا علی خاں کا

دور ایسا دور تھا، جس میں تعلیم و تربیت پر خاصا دھیان دیا گیا تھا۔ اور 1947ء آزادی ہند کے موقع پر نواب رضا علی خان نے رامپور کی ریاست کو ہند یونین سے جوڑا۔ ڈاکٹر رخسانہ عالم اپنی کتاب رامپور میں شعری روایات اور نظام رام پوری میں نواب رضا علی خاں کے تعلق سے لکھتی ہیں:

''اپنے دورِ حکومت میں تعلیم کے فروغ کی خاطر کالج اور اسکول کھولے۔ رامپور میں ہائی کورٹ قائم کیا اور صنعت و حرفت کی ترقی میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ چنانچہ متعدد بڑے کارخانے یہاں کھلے جس کی بنا پر رامپور صنعتی اعتبار سے یوپی میں کانپور کے بعد سب سے بڑا صنعتی شہر ہو گیا تھا۔'' [10]

6 مارچ 1966ء کو 60 سال کی عمر میں نواب رضا علی خاں کا انتقال ہوا

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

1۔ رامپوردرشن مرتب رئیس رام پوری صفحہ نمبر 5

2۔رامپور کا دبستان شاعری۔شبیر علی خاں شکیب ص20

3۔رامپور میں شعری روایات اور نظام رامپوری از ڈاکٹر رخسانہ عامل ص69/70

4۔رامپور۔۔تاریخ وادب از سعود الحسن خان روہیلہ ص 31

5۔رامپور کا دبستان شاعری رامپور۔شبیر علی خاں شکیب ص266/267

6۔رامپور میں شعری روایات اور نظام رامپوری از ڈاکٹر رخسانہ عالم ص74/75

7۔ رام پور تاریخ وادب۔تصنیف سعود الحسن خان روہیلہ ص نمبر37/38

8۔رامپور تاریخ ادب از سعود الحسن خان روہیلہ صفحہ نمبر39۔

9۔رامپور میں شعری روایات اور نظام رامپوری از مصنفہ ڈاکٹر رخسانہ عالم صفحہ نمبر 81

10۔ایضاً صفحہ نمبر85

(ب) دبستان رام پور کے شعرا

رام پور ایک ایسی ریاست تھی۔ جس کے اندر اردو شعرو ادب کی ترقی ہوئی۔ جس طرح دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ ، دبستانِ عظیم آباد، وغیرہ نے اردو زبان وادب کی آبیاری کی تو اس میں ریاست رام پور نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ دبستان ان دبستانوں سے الگ ہے ۔ کیونکہ اس دبستان کا وجود اس وقت ہوا جب اردو کے دوسرے دبستان ہنگامہ وقت کے شکار تھے۔ 1857ء کی ناکام بغاوت سے دلی اجڑ چکی تھی۔ ہر جگہ افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اس سے زبان وادب کے شعراء بھی متاثر ہوئے ۔ تب ملک میں امن وامان کہیں باقی تھا۔ تو وہ صرف لکھنؤ اور رامپور میں ہی تھا۔ یہاں کے راجاؤں اور نوابوں نے سخاوت کو پیش کرتے ہوئے دلی، لکھنؤ کے شعراء کو اپنے یہاں جگہ و پناہ دی ۔ رامپور ایک چھوٹی سی ریاست تھی مگر اس کے حکمران اور نواب بلند حوصلے کے مالک تھے ۔ جب اردو شعراء تنگدستی کے شکار ہوئے تو غالب جیسے بڑے شاعر جو مالی پریشانی میں گرفتار تھے۔ اسی ریاست کے نوابوں نے انہیں آسرا اور سہارا دیا ساتھ ہی پینشن بھی مقرر کی ، بہادر شاہ اور واجد علی شاہ کی اعانت سے لکھنؤ کے اکثر شعراء نے رامپور میں پناہ لی ۔ والی رامپور یوسف علی خان ناظم جو خود شاعر تھے۔ انہوں نے ان شعراء کی حوصلہ افزائی کی دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں کو اپنی پناہ میں لیا اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں ۔ کہ رام پور کی دبستان ایسی ہے کہ انہوں نے پوری اردو دبستان کو سہارا دیا اور لکھنؤ اور دہلی دبستان کا سنگم بنا اور ایک نئے دبستان کی بنیاد پڑی، اس دبستان کے روح رواں نواب ناظم علی خان تھے۔ پھر ان کے جانشین نواب کلب علی خاں ہوئے وہ بھی شاعر اور شاعر نواز تھے۔ ان لوگوں کی سرپرستی میں اس دبستان کو فروغ حاصل ہوا، دبستان رامپور شعراء کے کلام میں اشتراکیت رنگ کی شاعری کی جاتی ہے

۔جس میں مشکل بندی، اورآسان پسندی دونوں کا سنگم دہلی اور لکھنو کے دبستان شیر وشکر ہے۔ جو شعراء لکھنو سے رامپور پہنچے تھے۔ تو ان میں کچھ شعرا کو یہ احساس ہوا کہ ہمیں مشکل پسندی سے دور رہ کر سادگی اور معنی آفرینی کو اپنانا چاہیے۔ جو دبستان دہلی کی خصوصیات تھی۔ ان شعرا کو اسی طرف توجہ دلانے میں دبستان رامپور کا بہت بڑا ہاتھ رہا شاعروں کے کلام میں سادگی، زبان میں رنگینی ورعنائی کو فروغ دینے کا سہرا دبستان رامپور کے سر جاتا ہے۔ اس دبستان سے کافی شعراء شاعری کر رہے تھے۔ جس میں خود نوابین ریاست رامپور بھی شامل تھے۔ ان نوابوں میں اردو کے اچھے اور اہم شاعر بھی تھے۔ جیسے نواب یوسف علی خاں ناظم، نواب کلب علی خاں رام پور میں کئی شہروں کے شاعر ہجرت کر کے پہنچے جن میں حیدرآباد، بھوپال ٹونک، کے علاوہ دلی لکھنو وغیرہ کے شعرا کی بڑی تعداد تھی۔

اس ریاست کے والی نواب یوسف علی خاں ناظم نے جن شاعروں کی حوصلہ افزائی کی ان میں اہم نام امیر مینائی، داغ دہلوی، اور جلال لکھنوی اہمیت کے حامل ہیں۔ پر یہ ہے کہ رامپور کی دبستان نہ تو دلی دبستان اور نہ ہی لکھنؤ کی دبستان کی ہم پلہ تھیں۔ لیکن اس دبستان میں اتنی خصوصیت ضرور تھی کہ اس نے اردو شعر وادب کی خوب خدمت کی اور اردو ادب کو بلندیوں تک پہنچانے میں کافی مدد کی ہے۔ اس دبستان میں فن شاعری وقواعد لغت وغیرہ پر کئی کام ہوئے شاعری کے جملہ اصناف کے ساتھ نثری اصناف کی بھی خوب خدمت ہوئی، اس طرح اس نے اردو شاعری کو ایک الگ نیا رنگ وآہنگ عطا کیا، جس پر ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ اردو کے نثری وشعری اصناف پر دبستان رامپور کا بہت احسان ہے اس دبستان کے چند شعراء کا ذکر حسب ذیل ہے۔

امیر مینائی:

ان کی پیدائش 1826ء کو لکھنؤ میں ہوئی ان کا اصل نام امیر احمد تھا۔ ان کے والد کا نام کرم محمد مینائی تھا یہ شاہ، اودھ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا جس میں امیر مینائی اپنی تعلیم وتربیت حاصل کی جنہیں شاہی سر پرستی حاصل تھی، انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پھر فرنگی محل کے علماء سے عربی، فارسی، نجوم اور جغرافیہ وغیرہ کا علم حاصل کیا

شاعری کی طرف ان کا رجحان بچپن سے تھا۔ جب انہوں نے شاعری کرنا شروع کی اس وقت لکھنؤ میں آتش، ناسخ، بیمار، جیسے شاعروں کی تو تیاں بول رہی تھیں۔ اس زمانے میں انھوں نے ارشاد سلطانی ہدایت سلطانی لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں یہ کتابیں پیش کیں۔ اور اپنی رسائی دربار تک حاصل کرلی ان کی شاعری کی شہرت کے چرچے ہر جگہ عام ہو چکے تھے۔ جس کی بناپر نواب بھی ان سے ملنا چاہتے تھے۔ نمونہ کلام مندرجہ ذیل ہے۔

اگر درکار ہے رنگین تمہیں تکمہ گریباں کا
لگاؤ لعل اس میں قطرہ خون شہیداں کا
زنخداں پر جو ہم انگشت حنائی یار نے رکھی
تو میں سمجھا کہ یہ ہے زخن پھل اک شاخ مرجاں کا
خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
قریب ہے یارو روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان قاتل لہو پکارے گا آستین کا
ان کو آتا ہے پیار پر غصہ
ہم کو غصے پر پیار آتا ہے

امیر مینائی کے یہ اشعار ایسے ہیں کہ اپنی تہہ داری اور آفاقی عناصر کی بدولت ہر دور میں مقبول خاص و عام و زبان زد ہیں۔ امیر مینائی قصیدہ نعت حمد منقبت وغیرہ کی شاعری کے تمام صنف میں دسترس رکھتے تھے۔ امیر مینائی کا شعری شعور وقت کے اچھے شاعروں کے ہم پلہ تھا۔ جس میں ناسخ آتش، داغ وغیرہ کا ذہنی شعور اور ان کے شعری فکر میں موجود ہے ان کی وفات ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔

ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ انتخاب یادگار

۲۔صنم خانہ عشق

۳۔امیر اللغات

۴۔مراۃ الغیب

۵۔مینائے سخن

۶۔خیابان آفرینش

۷۔محامد خاتم النبیین

جلالؔ لکھنوی:

دبستان رام پور کے ایک مشہور داستان گو حکیم اصغر علی خان کے بیٹے تھے۔سید ضامن علی جلال 1834ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے جلالؔ لکھنوی کی ادبی شخصیت قدیم و جدید شاعری میں اہمیت کی حامل ہے۔دبستان لکھنو کے نمائندہ شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر والدین کی نگرانی میں ہوئی عربی و فارسی اور اردو کی چھوٹی موٹی کتابیں گھر پر پڑھ لیں تھیں۔نوابوں میں ان کا اثر ورسوخ تھا یہ کئی علوم کے ماہر تھے۔خاص کر علم طب کے اچھے جانکار تھے۔ان کا رجحان شاعری کی طرف تھا۔شاعری کی صلاحیت ان کو وہبی طور پر ملی تھی۔جس کی بنا پر بہت جلد شاعروں کے حلقے میں مشہور ہو گئے۔اس زمانے میں ان کا کسی مشاعرے میں شریک ہونا مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہوتی تھی۔امیرؔ، اسیرؔ، قلقؔ، جیسے استاد شاعروں کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ طبابت ان کا ذریعہ معاش تھا۔1857ء کے غدر میں ملک کی حالت درہم برہم ہوگئی تھی تو اس وقت نواب یوسف علی خاں کی دعوت پر یہ رامپور لائے گئے جلالؔ لکھنوی کے یہاں آنے سے دبستان رامپور کے وقار میں اضافہ ہوا ان کی وفات 1909ء میں ہوئی ان کی شاعرانہ فنی صلاحیت کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن جلال لکھتے ہیں۔

''جلال لکھنوی کی معیاری زبان کے مستند ماہر اور عروض کے کے کامل الفن استاد

سمجھے گئے لیکن کیا جو تھوڑی بہت قدر دانی زمانے کی وہ ان کے کمالات اور ان کی شاعرانہ عظمت کے مطابق تھی اپنے ہم عصروں میں شاید سب سے زیادہ بدقسمت جلال ہی تھے حالانکہ ان سب میں شہرت، عظمت اور عزت کے وہی سب سے زیادہ مستحق تھے امیر کو نواب صاحب رام پور کی استادی نے امیر الشعراء بنایا داغ کو نظام حیدر آباد کی استادی نے ''فصیح الملک'' اور بلبل ہندوستان، بنایا اور جلال نے یقیناً ان دونوں سے زیادہ ان خطابات کے مستحق تھے کسی خطابات یا کسی واضح قدر دانی کے بغیر خلوت گزیں اور ناکامی کی زندگی گزاری۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ زمانے کے مذاق کو ڈھالنا اب داغ کی ہلکی پھلکی شاعری کے ہاتھ میں تھا اور ان سطحی اور کبھی کبھی مبتذل مضامین نے اردو شاعری میں ایک نئے لہجے کی بناء ڈال دی تھی اس لہجے میں زبان کی چاشنی، اور روزمرہ کے چٹخارے کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کی چھیڑ چھاڑ اور جسمانی نشاط کے وہ نظارے تھے جو ہمارے ذوق شعری کو محیط کئے ہوئے تھے۔'' 1

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

دیوان اول : شاہد 1884ء

دیوان دوم: کرشمہ گاہ سخن 1884

دیوان سوم: مضمون ہائے دلکش 1888ء

دیوان چہارم: نظم نگارین 1903ء

1۔سرمایہ زبان اردو

2۔افادہ تاریخ

3۔منتخب القواعد

4۔تنقیح اللغات

5۔گلشن فیض

6۔دستورالفصحاء

7۔مفیدالشعرا

جلال لکھنوی ناسخ اسکول کے ایک اہم شخصیت تھی۔ساتھ ہی شاعری میں پیروی کرتے تھے۔ان کی شاعری کی عظمت یہ ہے کہ کہیں کہیں میر کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے۔شاعری میں دلکشی شوخی ظرافت ان کے یہاں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔قصیدہ گوئی کے میدان میں بھی یہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

قائم چاندپوری:

ایک غزل گوشاعر تھے۔ان کے کلام میں دلی دبستان کی خصوصیت موجود تھی۔جس میں بندش الفاظ نازک خیالی،معنی آفرینی تھی ان کو زبان و بیان پر مہارت حاصل تھی شاعری کی زمینوں میں انہوں نے طبع آزمائی کی ان کی غزلوں میں عشق و عاشقی کی جو معاملات پیش کئے گئے ہیں۔اس میں نازکی اور رمز وایما ہے۔میر کی طرح یہ بھی اپنی شاعری میں بڑی سے بڑی بات کو بہت ہی شگفتگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں ان کی پیدائش میں محققین کا اختلاف ہے لیکن قرینہ قیاس ۱۷۲۰ءکوان کی تاریخ پیدائش مانا جاتا ہے۔یہ یوپی کے ضلع بجنور میں پیدا ہوئے ڈاکٹر خالد علوی ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق سے لکھتے ہیں

> ''قائم ایک نیم دیہی زراعتی علاقے کے باشندے تھے ان کی ابتدائی افکار میں یقیناً ناپختگی رہی ہوگی۔تذکرہ مخزن نکات ایسی کسی کمی سے آلودہ نہیں ہے اور ایک صائب الرائے پختہ مشق فارسی نثر کی نباض کی تخلیق معلوم ہوتا ہے۔ان نکات کی روشنی میں تذکرہ ''مخزن نکات'' کے آغاز کے وقت قائم کی عمر کم ازکم پچیس سال ہونی چاہیئے۔ان شواہد کی روشنی میں تعین کیا جاتا ہے کہ قائم کا سال

پیدائش 1720ء یا 1719ء کے درمیان ہونا چاہئے، 1720ء ضروری ہونا چاہئے اگر قائم کا سال ولادت 1720ء تسلیم کیا جائے تو ٹانڈہ میں مصحفی سے ملاقات کے وقت پچاس برس اور انتقال کے وقت تہتر برس ہونی چاہیے۔ جو اکثر تذکرہ نگاروں کے بیان کے عین مطابق ہے۔ سودا کی ولادت 1707ء میں ہوئی۔ اس طرح وہ قائم سے تیرہ سال بڑے ہوئے جو استادی وشاگردی کے رشتے کے لئے خاصا معقول فاصلہ ہے۔"2؎

جلال لکھنوی ایسے شاعر تھے کہ جو دلی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے رام پور دربدری کی زندگی گزارتے ہوئے آخری وقت ریاست رام پور میں قیام پزیر ہو گئے۔ یہیں ان کا انتقال ۱۲۰۸ھ میں ہوا۔

قائم کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

تذکرہ: مخزن نکات ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۵۴ء

کلیات قائم چاند پوری، اور ایک دیوان موجود ہے۔

قائم کی شاعری میں اصلی رنگ ہندوستانیت ہے انہوں نے اپنی غزلوں میں ہندی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے مثلاً چتون، سہج، آکاش، میت، پریت، وغیرہ قائم کی غزلوں میں یہ ہندی کے الفاظ بعد کے شعرا کے لیے راہ ہموار کر دی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن سے قائم چاند پوری کی شاعری ایک شناخت قائم ہوتی دکھائی پڑتی ہے مثال کے طور پر۔

قائم قدم سنبھال کے رکھ کوے عشق میں
یہ راہ بے طرح ہے مری جان دیکھنا

چپ سی کچھ لگ گئی اسے جو کوئی
تجھ سے اک بار ہم کلام ہوا

رات کو چین ہے نہ دن کو تاب
دل ہے یارب کہ پارِ سیماب

دل کے تابع ہیں جو ہوا سو کیا
ہم سمجھتے نہیں ثواب و عذاب
ہم نے دیکھا ہے داغ دل قائم وقنا ربنا عذاب النار
مے پی جو چاہے آتش دوزخ سے تو نجات
جلتا نہیں وہ عضو جو تر ہو شراب میں

قآئم چاند پوری نے غزل گوئی کے علاوہ قصیدہ مثنوی کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔اور وہ اس میں کامیاب بھی ہیں ان کے اشعار میں سہل ممتنع کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔اورتشبیہات،استعارات وتلمیحات کے ذریعے قآئم چاند پوری نے اپنی شاعری کوسنوارا ہے۔انھوں نے عربی،وفارسی کے الفاظ کے بہ نسبت خالص اردو ہندی الفاظ کوفوقیت دی ہے۔ان کے کلام میں ہندوستانی تہذیب ہندوستانی مذاہب کی جھلکیاں خوب نظر آتی ہیں ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بخط ہند ہے قائم، گویا مرا دیواں
زبس کہ لکھ کے میں ہر بیعت پر قلم کھینچا
دل مرا تم کو تو لنکا ہے دسہرے کے بتا
فتح ہے سال بھر اس کی جو اسے لوٹے گا
وہ نخل خزاں دیدہ ہوں اس دشت میں جس کے
سایے میں کسی پنچھی نے بسرام نہ پایا

قائم چاند پوری دلی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے رام پور گئے۔در بدری کی زندگی گزارتے ہوئے آخری وقت میں ریاست رام پور میں سکونت پذیر ہوئے۔ان کا انتقال 1208ھ میں ہوا خالد علوی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

دلی کی سیاسی افراتفری کے باوجود یہ زمانہ قائم کی تخلیقی زندگی کا زرخیز ترین دور ہے
لیکن یہ دور میں عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اور قائم کو ہاو کرہا دلی اور سودا کی صحبت کو

> خیرآباد کہنا پڑا کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ شاہ عالم کی بدظنی ترک دلی کی وجہ بنی۔ کچھ برس قبل فرخ سیر نے ایک مزاحیہ شعر کی پاداش میں جعفر زٹلی کو قتل کرا دیا تھا۔ بہرحال چارو ناچار قائم کو دلی سے مراجعت کرنی پڑی۔ او باقی تمام عمر کسمپرسی میں گزارنی پڑی۔ اس درمیان قائم نے دوبارہ لکھنو کا سفر کیا۔ بسولی ٹانڈہ اور رامپور کے سفر بھی کئے۔ ٹانڈہ میں محمد یار خاں کی سرکار میں 100 روپیہ مہینہ پر ملازم ہوے، اور نواب کی غزلوں کی اصلاح ان کی ذمہ داری قرار پائی۔ (واضح رہے کہ تقریباً سو سال کے بعد استاد ذوق جب بہادر شاہ ظفر کے ملازم ہوئے تو ان کی تنخواہ صرف چار روپیہ مہینہ مقرر ہوئی۔) نواب موصوف سے قائم کے تعلقات اس درجہ قریبی تھے کہ مصحفی کی ہی اطلاع کے مطابق نواب کی سرکار میں مصحفی کی قصیدہ خوانی اور ملازمت کا سبب بھی قائم ہیں بنے۔ لیکن جنگ سکرتال 1772ء کے بعد قائم کو دربدری اختیار کرنی پڑی۔ یہ محفل اجڑنے کے بعد قائم چند سال لکھنؤ قیام کر کے رامپور آ گئے۔ رام پور کے قیام کے دوران بھی قائم دوسری بار لکھنو گئے اور غالباً من سلیمان شکوہ کی سفارش اور راجہ ٹکیت رائے کے دستخط سے اپنا روزنہ اور جائیداد بحال کرا کے واپس رامپور آئے جہاں موت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ 3

دبستان رامپور کے یہ وہ مشہور شعرا ہیں جنھوں نے اردو شاعری میں بھی اپنا لوہا منواتے رہے ہیں اور وقت کے اہم شعراء کے شانہ بشانہ چلتے رہے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اور کئی ایک شعراء دبستان رام پور سے منسلک رہے ہیں۔ جنہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سے اردو کو بہت بہترین سرمایے دیئے۔ ان میں محمد یار خاں ضیاء الدین عبرت، محسن کاکوری، کبیر اللہ خان تسلیم، قدرت اللہ خاں شوق، عنبر شاہ خاں آشفتہ، داغ دہلوی، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان شاعروں کے علاوہ نوابین رامپور کا بھی اردو شاعری میں حصہ ہے اور انہوں نے اردو شاعری کو بہترین سرمایہ دیا ہے۔ اور ساتھ ہی انہوں نے اردو زبان کی خدمت گزاروں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ محمد یار خاں یہ دبستان

رامپور کے ایسے شاعر تھے۔ جولکھنؤ سے رامپور آئے ہوئے تھے۔ اور یہاں کے نوابوں نے ان کا سالانہ وظیفہ متعین کیا تھا۔ ان کو شاعری کے ساتھ موسیقی اور شکار کا شوق تھا۔ انہوں نے قائم چاند پوری کو اپنا استاد بنایا تھا۔ ان کے کچھ اشعار کے نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں۔

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دل ناتواں نے بہت کیا
کوئی گزر تیرے کو میں نہ کر گیا ہوگا
جو گزرا ہو گا تو جی سے گزر گیا ہوگا
جوں نقش قدم نام کو ہستی ہے ہماری
ایک باد کے جھونکے نہ ہم ہیں نہ نشا ہیں
کن چھوڑ کے ہم پہ جہاں چلے
آ تو حد سبک تھے یہ کتنے گراں چلے
گر وقت ذبح نالہ کیا میں کیا ہوا
پیارے کسی کا ہاتھ کسی کی زباں چلے

مندرجہ بالا سطروں کو دبستان رامپور کے شعرا کے کلام کو پیش کیا ہے جس سے یہ واقفیت ہوتی ہے کہ ان شعراء نے بھی اس دور میں بڑے شاعروں کے مقابل اپنی تخلیقی سفر کو جاری وساری رکھا تھا۔

☆☆☆☆☆

حوالاجات

1۔جلالؔ لکھنوی مرتبہ جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب ص ۲۸و۲۹

2۔قائم چاند پوری، خالد علوی ص۳۲

3۔ایضا ص38

باب دوم ۔ نظام رامپوری کی سوانح حیات

نظاؔم رام پوری کی سوانح حیات

نظاؔم رامپوری کی پیدائش 1239ھ مطابق 1823ء میں محلّہ گھیر سخی رامپور میں ہوئی۔ نظام کا اصل نام سید نظام شاہ اور تخلص نظاؔم تھا۔ ان کے والد کا نام سید احمد شاہ تھا۔ نظاؔم کے نام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بقول راز یزدانی:

> ''نظام کا اصل نام جوان کے باپ نے رکھا وہ ذکریا شاہ تھا۔ نظام کی مہر کے خاکے کا ڈیزائن ذکریا شاہ کے نام سے تھا۔'' [1]

راز یزدانی صاحب نے نظام کے نام کی مہر کا ذکر کیا تب رضا لائبریری میں اس مہر کو بہت ڈھونڈا گیا۔ مگر یہ مہر آج تک کسی کو نہ مل سکی اور نہ ہی اس مہر کا عکس یا فوٹو مل سکا۔ قدرت رام پوری نے نظاؔم رامپوری کی کلیات کو شائع کرایا تب انھوں نے بھی سید ذکریا شاہ کا انکار کیا اور سید نظام شاہ اور تخلص نظاؔم کلیات میں درج کیا۔ امیر اللہ تسلیم نے بھی اپنی تقریظ میں سید نظام شاہ لکھا ہے۔ امیر مینائی انتخاب یادگار میں رقمطراز ہیں:

> ''نظام تخلص، سید نظام شاہ ابن سید احمد شاہ بڑے خوش فکر اور خوش مزاق، شعری عاشقانہ کہنے میں طاق تھے۔'' [2]

خود نظام نے بھی اپنی شاعری میں اپنے نام کا ذکر کیا ہے۔

در پر کھڑے ہیں اس لئے سید نظام شاہ
محفل ہم کو اپنی بلائیں کسی طرح
کہتے ہیں دیکھ دیکھ کے رسوائیاں میری
سید نظام شاہ نے رسوا کیا مجھے

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی مشہور و معروف کتاب تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں:

''نظام شاہ کا پورا نام سید نظام شاہ اور نظام تخلص تھا۔'' ۳۳

ان تمام مذکورہ بالا حوالاجات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظاؔم رام پوری کا اصل نام سید نظاؔم شاہ اور تخلص نظاؔم ہے۔ راز یزدانی صاحب نے جو نظاؔم رام پوری کے بارے میں کہا کہ ان کا نام ذکریا شاہ ہے۔ اور ایک مہر کا ذکر کیا۔ لیکن اس بات کے ثبوت میں ان کے پاس کوئی پختہ دلیل نہ ہونے کی وجہ سے راقم ان کے قول سے متفق نہیں ہے۔ اگر مستقبل میں وہ مہر کہیں سے دستیاب ہو جائے تو ان کے نام کے بارے میں مزید انکشافات ہو سکتے ہیں۔

خاندان:

نظاؔم رامپوری کا خاندان روہیل کھنڈ آنے سے قبل پاکستان یوسف زئی علاقہ میں مقیم تھا۔ نظام کے اجداد میں عبداللہ شاہ کو آنولہ آنے کی دعوت علی محمد خان نے دی۔ ان کے بعد سادات جیلانی اور سادات ترمز اور سادات بخارہ کے بزرگوں کو بھی نواب علی محمد خان نے آنولہ بلایا۔ یہ لوگ ان کی دعوت پر آنولہ تشریف لائے۔ اس وقت زیادہ تر آنولہ میں پٹھان قوم کے لوگ مقیم تھے۔ اس وجہ سے یہ پٹھانوں کا محلّہ کہلایا۔ ان کی زبان پشتو اور ان کا حلیہ پگڑی والا تھا نظاؔم رامپوری کے جداعلی سید عبداللہ شاہ روہیل کھنڈ میں پیر کی حیثیت سے جانے جاتے، اس وقت نواب علی محمد خاں بانی روہیل کھنڈ ان کے مرید تھے۔ سید عبداللہ کے فرزند سید محمد شاہ ان کے بیٹے عبدالقادر انھوں نے رامپور میں پرورش پائی، ان کے دو بیٹے فتح علی شاہ اور چراغ علی شاہ۔ فتح علی شاہ کے دو بیٹے سید محمد شاہ اور سید احمد شاہ ہیں اور یہ نظام رامپوری کے والد سید احمد شاہ ہیں۔ نظام نے اپنے خاندان کا تعلق شاہ عبدالقادر جیلانی سے متصل کیا ہے۔ ایک جگہ وہ اپنی شاعری میں بھی اس چیز کا ذکر کرتے ہیں۔

دولت فقر ہے آل شہ جیلانی ہوں نظام
اس کی پروا ہے کسے ہاتھ میں ذر ہو کہ نہ ہو
میں سید خاص ہوں اولاد حضرت جیلاں کی
سبھی اس بات سے واقف ہیں کیا ناداں کیا دانا

پروفیسر عبدالشکور نظاؔم رامپوری کے خاندان کے تعلق سے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''ان کے والد کا نام سید احمد شاہ تھا نظام کا نام سید نظام شاہ تھا خاندانی اعتبار سے صحیح النسب سید تھے ان کا سلسلہ نسب بارہویں پشت میں حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔[۴]

والد محترم:

نظاؔم رامپوری کے والد کا نام سید احمد شاہ ولد سید فتح علی شاہ تھا۔ ان کی پیدائش رامپور کے محلّہ گھیر سخی میں ہوئی جب ہوش سنبھالا تبھی سے ذمہ داری سر پر عائد ہوگئی۔ ابتدا میں کاشت کاری کی کچھ سال بعد نواب صاحب کے دربار میں اسپ سواروں کی ضرورت تھی۔ نواب صاحب کے وزیر کے ذریعے اس نوکری کو حاصل کیا اور ساتھ میں اپنے چھوٹے بھائی سید محمد شاہ کو بھی اپنے ساتھ اسی کام میں لگا لیا۔ لیکن طبعیت خراب رہنے کی وجہ سے گھوڑوں کی اچھے طریقے سے دیکھ بھال نہ کر پاتے۔ اسی وجہ سے نوکری سے جلد ہی دستبدار ہو گئے لیکن اپنی جگہ اپنے صاحبزادے سید نظام شاہ کو اس نوکری پر لگا دیا۔

والدہ محترمہ:

نظاؔم رامپوری کی والدہ محلّہ پیلا تالاب رامپور کی رہنے والی تھیں۔ یہ امور خانہ داری سے اچھی طرح واقف تھیں۔ پانچوں وقت کی نمازی اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ تینوں اولادوں میں سب سے زیادہ لگاؤ نظاؔم رامپوری سے تھا۔ نظاؔم رام پوری جب کوئی شعر کہتے تو پہلے وہ اپنی ماں کو سنایا کرتے۔ نظام کی والدہ صبر و تحمل کا مجسمہ تھیں۔ نظام کے والد اکثر بیمار رہتے تھے اس وجہ سے نظام کی ماں کو پریشانی رہتی اور گھر چلانے میں تنگی ہوتی، اس لئے ان کے گھر کی معاشی حالت کمزور رہتی۔ لیکن انھوں نے گھر کو بنائے رکھا اور صبر سے کام لیا۔ چالیس سال کی عمر میں نظاؔم رامپوری کی والدہ اس دنیا سے رحلت ہوگئیں۔

بھائی:

نظام کے ایک چھوٹے بھائی تھے جن کا اسم گرامی سید منور شاہ تخلص منوؔر تھا۔ وہ بھی ریاست رامپور میں اسپ سوار کی حیثیت سے ملازم رہے۔ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے اور یہ اپنے بڑے بھائی نظاؔم رامپوری کے شاگرد تھے۔ ان کے چند اشعار نمونہ کلام کے طور پر مندرجہ ذیل ہیں:

یہ راز دوستوں سے بھی کہنا نہ تھا مجھے
دشمن سے ان کا شکوہ کیا میں نے کیا کیا
خود بینی ان کو اور منور ہوئی فزوں
آئینہ آپ لا کے دیا میں نے کیا کیا

انتخاب یادگار میں امیر مینائی ان کا ذکر کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

''نام سید منور شاہ تخلص منور ابن سید احمد شاہ اٹھائیس برس کی عمر۔۔سید نظام شاہ اپنے بڑے بھائی کی شاگردی سے نامور ہیں۔'' ۵؎

بہن:

نظاؔم رامپوری کی بہن کا نام بیگماں جان تھا۔جن کی شادی رامپور کے ایک معزز سید گھرانے میں سید محسن علی سے ہوئی تھی۔ بیگماں جان نیک سیرت صوم وصلوت کی پابند تھیں۔ان کے ایک بیٹے جن کا نام شریف احمد تھا یہ بھی ایک شاعر تھے۔امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں ان کا ذکر کچھ اس طرح سے کیا ہے:

''شریؔف تخلص سید شریف احمد نام ولد سید محسن علی خواہرزادہ میاں نظام شاہ ہیں بیس برس کی عمر ہے۔میر احمد علی رسا کے فیض تلمذ سے نیک نام ہیں۔'' ۶؎

سید شریف احمد فارسی اچھے عالم اور صوفی انسان تھے۔اپنے والد کے ساتھ کاشت کاری کیا کرتے تھے۔ شاعری کا شوق انھیں وراثت میں ملا تھا۔اپنے ماموں نظاؔم رامپوری کے بہت قریبی تھے اور اکثر ماموں صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔انھیں کو اپنا کلام دکھایا کرتے اور نظاؔم رامپوری ان کے کلام پر اصلاح بھی کیا کرتے تھے۔

تعلیم:

نظاؔم رامپوری کی تعلیم کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ جس زمانے میں وہ پیدا ہوئے اس وقت بچے تعلیم حاصل کرنے کے لئے کسی مسجد یا بزرگ کے پاس جاتے تھے۔اس کے علاوہ ایک رواج یہ بھی تھا کہ فارسی اور اردو گھر پر ہی پڑھائی جاتی تھی۔نظام کا تعلق بھی ایک تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔اس لئے بسم اللہ پڑھنے کے بعد نظام کی تعلیم وتربیت زمانے کے رواج کے مطابق محلّہ کے مکتب میں ہوئی۔ جامع مسجد مدرسہ جو مکتب رامپور کے نام سے

مشہور تھا، ان کے گھر کے قریب میں ہی تھا۔ اس لیے نظام نے ابتدائی کتب فارسی و اردو اسی مدرسہ میں پڑھی ہوں گی۔ عربی کی تعلیم کسی حد تک رہی لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا۔ پروفیسر عبدالشکور نظاؔم رامپوری کی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان کی تعلیم کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمانے کی رسم کے مطابق وہ علوم متادلہ سے اچھی طرح سے واقف تھے۔ فارسی اور اردو گھر پر پڑھی۔ لیکن دیوان کے دیکھنے سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کوئی عالم معتبر تھے۔ اس زمانے میں فارسی کا درس اچھے گھرانوں جا بجا دیا جاتا تھا۔ مکاتیب میں فارسی کی معیاری اور استعدادی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ گھر گھر شعر

چرچہ تھا۔ یوں تو درباری لوگ اس زمانے میں بالعلوم شاید زیادہ پڑھے لکھے نہ ہوتے تھے لیکن ان کی عام واقفیت اور کلچر یقیناً بلند اور عالمانہ ہوتی تھی۔ اس بنا پر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ نظام اردو اور فارسی سے بخوبی واقف تھے۔'' [7]

شاعری کے استاد:

نظاؔم رامپوری کے استاد شیخ علی بخش بیمار تھے۔ ان کے علاوہ نظام کے پیر جن کے ہاتھ پر انھوں نے بیعت کی علی احمد جو ایک خانقاہ کے سجادنشیں تھے نظاؔم رامپوری نے شاعری میں ان سے بھی اصلاح لی۔

علی بخش بیمار کی شاگردی کے متعلق فائق صاحب یوں لکھتے ہیں۔

''اگست 1840ء میں نواب محمد خاں مسند نشین ریاست ہوے اور ان کے ساتھ جو بیرونی ادیب اور شاعر آئے وہ بیشتر لکھنوَی اور دہلوی تھے، اور نواب محمد سعید خاں لکھنئو دہلی دونوں مقامات پر قیام کر چکے تھے ارباب علم وفن سے ان کی ما چھی شناشائی تھی۔ ان میں نمایا نام بیؔمار اور تسکیؔن کا تھا۔ مصحفی غفلت رامپوری کے شاگرد تھے، ان کا رنگ سخن پسند کیا گیا، رامپور کے بہت سے نوجوان ان کے شاگرد ہوئے۔ نظام کے پیر میاں احمد علی شاہ بھی بیمار کے دل دارہ تھے۔ اسلئے نظام رامپوری نے بھی ان کی شاگردی اختیار کی۔'' [8]

نظاؔم رامپوری نے علی بخش بیمار کے علاوہ بھی نواب یوسف علی خان ناظم کی شاگردی اختیار کی تھی، نظام رامپوری نے انہیں اپنا کلام دکھایا تھا۔

ذکیہ جیلانی نظام رامپوری کی شاگردی کے متعلق لکھتی ہیں۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کے سب سے مشہور شاگرد ذکریا شاہ نظام تھے، ریاست کے اسپ سواروں میں ملازم تھے۔ 9

شادی اور ازدواجی زندگی:

نظآم رامپوری کی شادی کب ہوئی اور کس عمر میں ہوئی اس کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا ہے۔قیاساً ۱۸ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوئی تھی۔انھوں نے تقریباً 27 یا 28 سالہ ازدواجی زندگی بسر کی۔ان کے خسر کا نام سید امام علی تھا جو رام پور کے رہنے والے تھے۔نظآم رامپوری اپنی بیوی کے ساتھ عیش وعشرت والی زندگی بسر نہیں کر سکے۔نظآم رامپوری کی تنخواہ کل 10 روپے مہینہ تھی اور شراب بہت پیتے تھے دوسرے یہ کہ ان کا ایک چنو نام کی طوائف سے معاشقہ ان کا تھا جس کی بنا پر نظآم رامپوری اور ان کی بیوی کے درمیان ان بن رہتی تھی۔

نظام شراب اور معاشقے کی وجہ سے فضول خرچی کرتے تھے، اور بیوی تنگ دستی میں زندگی بسر کرتی۔ابتدا میں نظآم رامپوری کی بیوی نے ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنی اس خصلت سے باز نہ آئے۔اسی تنگ دستی کی وجہ سے نظام کی بیوی اکثر اپنے میکے میں رہتی تھیں۔آخر کار ایک دن ایسا آیا کہ نظام کی شراب کی وجہ سے قرضہ ہو گیا تب مجبوری میں نظام کو اپنا گھر فروخت کرنا پڑا۔اس کا ذکر انھوں نے اپنی کلیات میں کیا ہے۔نظام کی بیوی سے ناچاقی ہوئی اور وہ اپنے میکے چلے گئی اور وہیں رہنے لگی۔نظام کی آخری اولاد قیصر شاہ کی ولادت بھی ان کی نانی کے گھر میں ہوئی۔آخر میں نظآم رامپوری نے شراب ومعاشقہ ترک کر دیا تھا۔مگر ان کی بیوی اپنے میکے سے واپس نہیں آئیں۔

ملازمت:

نظآم رامپوری کے والد سید احمد شاہ اور ان کے چچا سید محمد شاہ ریاست رامپور کی فوج میں گھڑسوار کے عہدے پر فائز تھے۔یہ ملازمت انہیں وراثت میں ملی۔کیونکہ یہی نوکری ان کے والد کیا کرتے تھے۔کم عمری سے نظآم رامپوری نے اس ملازمت کی ابتداء کی اور عمر کے آخری مرحلے تک کیا مگر افسوس کسی بڑے عہدے پر فائز نہ ہو سکے۔ ریاست مین اسپ سواروں کی تنخواہ 18 یا 20 روپے ماہوار ہوا کرتی۔اس میں سے آدھی تنخواہ ہی ان کو ملتی تھی۔کیوں کہ اسپ سواروں سے کوئی محنت کا کام نہ لیا جاتا تھا۔ان کو ایک گھوڑا دے دیا جاتا تھا جس کی دیکھ بھال کا کام ان سے لیا

جاتا تھا۔ ریاست کے بڑے عہدے دار آکر گھوڑوں کا معائنہ کرتے تھے کہ کسی نے گھوڑے کو کمزور تو نہیں کر دیا گھاس وقت مقررہ پر دی جارہی ہے یا نہیں۔

ان تمام چیزوں کا معائنہ کرنے کے بعد تنخواہ دی جاتی تھی لیکن کبھی کبھی وقت مقررہ پر تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی۔ اسپ سواروں کو کبھی کبھار لگان وصولنے کی ذمہ داری بھی دے دی جاتی تھی۔ ریاست کے اسپ سواروں کو ایک فائدہ تھا کہ اگر ان کے گھر کسی بچے کی ولادت ہوئی تو اس کا وظیفہ ریاست کی طرف سے مقرر کر دیا جاتا تھا۔ نظآم رامپوری کے پاس اپنے والد کی کچھ زمین تھی۔ اس زمین سے کچھ اناج مل جاتا تھا۔ آخر کار گھر اور زمین بھی غلط فعلوں کی وجہ سے فروخت کر دی۔

ملازمت ہونے کے باوجود نظام کی زندگی معاشی اعتبار سے تنگدستی میں گزری کیوں کہ ان کے اعمال اچھے نہ تھے۔ جس کی وجہ سے جوانی اور بڑھاپا دونوں میں نظام کو مشکلوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

نظام کا معاشقہ:

نظام ایک طوائف سے محبت کر بیٹھے۔ اس دور میں رامپور میں خوب مجرے ہوا کرتے تھے۔ اگر کسی کے گھر شادی ہوتی تو وہ لوگ طوائفوں کو ناچ گانے کے لئے بلاتے تھے۔ چنو نامی ایک طوائف تھیں جو مرادآباد سے ۳۰ کلومیٹر دور بجنور والے روڈ پر ایک قصبہ کانٹھ ہے وہاں کی رہنے والی تھی۔۔ نظآم رامپوری اس وقت جوانی کے عالم میں تھے۔ اس وقت نظآم رامپوری شادی شدہ تھے۔ نظام ان تمام فعلوں میں اس سے قبل بھی ملوس رہے۔ ان کی ملاقات چنو سے کہاں ہوئی ااس بات کا علم نہ ہوسکا رامپور کے قلعہ یا کسی طوائف کے کوٹھے پر ہوئی ہوگی۔ اس وقت ریاست رامپور میں طوائف کے کوٹھے بھی جگہ جگہ ہوا کرتے تھے۔ رامپور میں بہت سے میلے لگتے اس میں ایک میلہ بے نظیر کا بھی تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ نظام کی ملاقات اپنی معشوقہ سے میلہ بے نظیر میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی محبوبہ کا ذکر اپنی شاعری میں دلربا کے نام سے کیا ہے۔

نام اس کا شوق سے پوچھتا ہوں میں بار بار
جس کسی کا نام ہو اس دلربا کے نام پر

شاعری میں محبوبہ ہوتی ہے کسی کی فرضی ہوتی ہے کسی کی حقیقی۔ طوائف بہت طریقے کی ہوتی ہیں۔ چنو

طوائف ڈیرے والی طوائف ہے جو گانے بجانے اور مجرے وغیرہ کرتی تھی۔ نظام کو موسیقی سے بہت رغبت رہی۔ طوائف کسی کے پاس زیادہ دیر نہیں رکتی ہیں۔ نظام کی تو معاشی حالت بھی کمزور تھی اور تنگ معاش انسان تھے اور یہ چنو طوائف سے شادی بھی کرنا چاہتے تھے لیکن چنو کے دل میں ان کے تعلق سے ایسی کوئی بات نہ تھی پھر بھی ایسا ضرور تھا کہ اگر نظام نکاح کا کہتے تو انکار نہیں کرتی۔

چنو کے چاہنے والے بہت تھے مگر اس کا ساتھ صرف نظام کو حاصل تھا یہ اس سے ملنے اس کے گھر بھی جاتے تھے۔ اس کے تعلق سے کلب علی خان لکھتے ہیں:

''رامپور میں چنو کانٹھ والی رہتی تھی۔ اس سے ان کے تعلقات تھے۔ بات یہاں تک بڑی کے نظامؔ اس سے نکاح کرنے لگے پیر سے اجازت چاہی انھوں نے سمجھایا کے تم سید ہو تمہارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک طوائف سے شادی کرو۔ نظام نے مختلف پہلو سے بات کو سرسبز کرنا چاہا لیکن پیر نے اجازت نہ دی۔ آخرکار نظام کو اس محبت سے دستبردار ہونا پڑا۔ کہتے ہیں کہ اس طوائف سے تعلق کے سلسلہ میں نواب یوسف علی خان نے بھی اعتراض کیا تھا کہ نظام تم ایک طوائف کے گھر جاتے ہو۔ نظام نے کہا کہ سرکار کی شاعری کے لئے سب اسباب مہیا ہیں۔ میں نے اپنی شاعری کے لئے طوائف کا انتخاب کیا ہے۔'' 10؎

نظام رامپوری کے معاشقے کے تعلق سے ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ شاد عارفیؔ اپنے مضمون میں چنو طوائف کی جگہ مہترانی کا ذکر کرتے ہیں۔

''پنڈت نے یہ بھی بتایا کے آخر عمر میں ایک میترانی جو گھر میں کمانے آتی تھی سید نظام شاہ ان سے محبت کرنے لگے تھے مگر بےلوث اور پاک۔ پنڈت کا کہنا ہے کہ میترانی بھی بڑی مزاج شناس تھی جب نظام صاحب خاموش ہوتے یا کوئی شعر کہتے تو وہ کوئی نہ کوئی چٹکی لے لیتی تھی اور نظام صاحب بھڑک جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ بیمار پڑ گئی اور کئی دن تک نہ آئی تو آپ آبدیدہ بھی ہوئے اور اس کے مزاج پرسی کو اس کے گھر بھی تشریف لے گئے۔'' 11؎

شاد عارفی صاحب کے اس قول سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ چنو کانٹھ والی کے علاوہ بھی نظام رامپوری کا

معاشقہ میترانی سے تھا اورعرف عام میں اس کو بھنگن کہتے ہیں۔

نظام کی شراب نوشی:

نظام کثرت سے شراب نوشی کیا کرتے تھے اوراسی شراب نوشی کی وجہ سے بیوی سے اکثر جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ان کا ذاتی خانگی اورسماجی سکون درہم برہم ہوگیا۔حقیقت اشیاء یہ ہے کہ ہرموجودہ شہ فی نفسہ دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک پہلوخیر کا ہےاوردوسرا شرکا ہے۔ ہرشہ میں بیک وقت تعمیراورتخریب کی قوتیں کارفرما ہیں اوراسی کا نام دنیا ہےاور ان دونوں کےتوازن کا نام زندگی ہے۔

وہ شہ چاہےعلم ہواس میں بھی خیراورشر کے دونوں پہلوموجود ہیں۔علم مفید بھی ہے اورنقصان دہ بھی اسی طرح شراب میں بھی یہ دونوں پہلوموجود ہیں۔شر کا پہلو غالب ہےاس لیےعوام الناس کے لئے نقصان دہ ہے۔ایک یونانی کہاوت ہے:

''کوئی گیت لمبی عمرنہیں پاسکتا اورزیادہ دیرمسرت نہیں بخش سکتا اگراسے کوئی ایسا شاعر لکھے جو پینے میں فقط پانی پیتا ہو۔''

ہمارےبعض شاعراس کہاوت پر باقاعدہ ایمان لائے اوراپنے اس ایمان کی تازگی کے لئے وقفے وقفے سےعملی طور پرمتفق بھی فرماتے رہے۔ایک اہل علم کی روایت کےمطابق نظام شراب پیتے تھے ان کے پیرکوخبر ہوئی انھوں نےمنع کیا لیکن ان سے نہ چھوٹی۔ایک دن مدہوشی کی حالت میں پیر کے پاس آئے۔آپ نے پانی دم کر کے پلایا ہوش میں آگئے۔دوبارہ پھردم کر کے پانی پلایا اس کے بعد نظام نے پھرشراب نہیں پی لیکن پاؤں میں لغزش اور آنکھوں میں ڈورےتمام عمر رہے۔شراب نوشی کا ذکران کےاشعار میں بھی ملتاہے۔

صراحی میں گل گوں بغل میں ساتھ میں ساغر
خرام ناز کرتا ساقی مستانہ آتا ہے
رخصت آرزوئے خلد بریں
کوچہ یار تک رسائی ہے

نظام کا سفرٹونک:

نظام رامپوری نے اپنی زندگی میں صرف ایک سفر کیا جو سفرِ ٹونک کے نام سے مشہور ہے۔ وہ حیدر آباد بھی جانا چاہتے تھے مگر سفر کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے اور اسپ سواروں کی ملازمت کی وجہ سے وہ حیدر آباد نہ جا سکے۔۔اس سفر کا ذکر ان کے بیٹے قیصر شاہ نے کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے میری ماں نے بتایا تھا کہ ایک بار تیرے والد ٹونک گئے تھے۔ان کے ایک شعر سے بھی ٹونک کے سفر کا پتا چلتا ہے۔

کچھ آپ کو خبر بھی ہے سید نظام کی
بے چارہ تنگ آ کے وطن سے نکل گیا
رہنے کی ٹونک میں کوئی صورت نہیں نظام
چلیے کہیں یہاں سے دل اپنا اٹھایئے

سفرِ ٹونک جانے کی وجہ کہ نظام اپنی قسمت آزمانے کی غرض سے وہاں گئے ہوں مگر وہاں ذریعہ معاش کے اسباب نہ بننے کی وجہ سے واپس رامپور آ گئے ہوں۔

مشاعروں میں شرکت:

دبستان رامپور میں دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی طرح مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔مشاعروں کا انتظام کبھی ریاست کی جانب سے اور کبھی کبھار جو با مشرف اور شعر و شاعری سے شغف رکھنے والے لوگ بھی اپنے گھروں میں مشاعروں کا انعقاد کرتے تھے۔ دبستان رامپور کے مشاعروں میں امیر مینائی، داغؔ دہلوی، غالبؔ اور رامپور کے دیگر شعرا شرکت کیا کرتے تھے اور لوگوں کو اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔

نظام رامپوری کو بھی مشاعروں میں شرکت کرنے میں بہت دلچسپی تھی۔ بہت سے مشاعروں میں انھوں نے شرکت کی۔ کچھ مشاعرے قلعہ کے اندر ہوتے ان مشاعروں میں نظام کو جانے کو بہت کم موقعے فراہم ہوتے کیوں کہ یہ مشاعروں کی محفل نواب یوسف علی خان ناظم کی طرف سے منعقد کی جاتی تھی۔ اس میں درباری شاعر ہی شرکت کرتے تھے۔اور ریاست کے شاعروں کو کم ہی موقع ملتا تھا۔ ریاست میں سید اور خان صاحب زیادہ رہتے تو ان لوگوں کو مشاعروں میں کا شوق اور اردو زبان سے شغف تھا۔

ایک مشاعرے میں داغؔ دہلوی دہلی سے تشریف لائے۔ یہ مشاعرہ نواب یوسف علی خان کے داماد محمد رضا

خان کے گھر پر تھا۔ داغؔ کا یہ پہلا مشاعرہ تھا جو وہ دہلی سے باہر آ کر رامپور میں پڑھ رہے تھے۔ اس زمانے میں نظامؔ رامپوری نے مشاعروں میں جانا کم کر دیا تھا مگر اس مشاعرے میں ان کیکچھ احباب ساتھ میں لے گئے۔ جب وہ مشاعرے میں پہنچے تو داغؔ دہلوی اپنی یہ غزل پڑھ رہے تھے۔

بھولے بھٹکے جو تیرے گھر میں چلے آتے ہیں
اپنی تقدیر کے چکر میں چلے آتے ہیں
وحشت ایسی ہے کہ سائے سے بھی میں کہتا ہوں
آپ کیوں میرے برابر میں چلے آتے ہیں

داغؔ دہلوی کی زبان آسان تھی لیکن ان مشاعرے میں ان کا کوئی شعر اس رنگ کا نہیں تھا کے وہ آگے چل کر مشہور ہوا ہو۔ داغؔ کے بعد نظام کی باری آئی تو انھوں نے اپنی یہ غزل پیش کی۔

اس کا گلہ نہیں، نہ ہو وعدہ وفا نہ ہو
اتنا تو ہو کہ رشک مجھے غیر کا نہ ہو
انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

وہ اپنی غزل سے چنندہ اشعار پڑھ رہے تھے کہ محفل میں خوب واہ واہ ہونے لگی۔ پھر وہ ایک نئے انداز میں اس غزل کو پڑھتے ہیں اور قافیہ کو ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔

اٹکھیلوں سے اور کس ادا کے ساتھ
مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
اس کا وہ نیچی نیچی نگاہوں سے دیکھنا
اور یہ بھی دیکھنا کہ کوئی دیکھتا نہ ہو
کروٹ بدلنے میں جو دوپٹہ سرک گیا
گھبرا کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

اب میں ہوں تم ہوکون ہے کس کا لحاظ
کیا اس کا ذکر ہے کوئی دیکھتا نہ ہو
کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام
ہم ایسے ہیں جیسے کسی کا خدا نہ ہو

نظام کی تصانیف:

نظامؔ رامپوری نے جوانی سے آخری دم تک شعر کہتے رہے، مگر انھوں نے اپنا کلام محفوظ رکھنے کی طرف توجہ نہ دی۔ طبعیت میں سادگی اور مزاج میں شگفتگی تھی۔ اگر وہ چاہتے تو اپنا کلام بذات خود محفوظ کر کے رکھ سکتے تھے لیکن انھیں اپنے کلام کی تدوین کی کوئی فکر نہ تھی اور یہ نظام صاحب کی سب سے بڑی بھول تھی جس سے نظام رامپوری کے زیادہ تر کلام کے ضائع ہونے کا امکان ہے۔ عبدالشکور لکھتے ہیں:

''نظام کے کلام کی ترتیب و تدوین بھی بڑے عجیب انداز میں ہوئی ہے۔ نظام فطرتاً کچھ حقیقی معنوں میں شاعر تھے۔ ان کی شوریدہ سری اور وارفتہ مزاجی کا یہ ادنہ کرشمہ تھا کہ عمر بھر شعر کہے لیکن دیوان مرتب کرنے یا اپنا کلام محفوظ کرنے کا خیال بھی ان کو پیدا نہ ہوا چناچہ ان کے انتقال کے وقت نواب خلد آشیاں نے وہ تمام مسودات منگوا لئے جو ان کے مکان میں موجود تھے۔'' 12ؔ

سب سے پہلے قدرت علی خان صاحب نے نظام رامپوری کے کلام کو یکجا کیا اور جو کلام موجود نہ تھا وہ تلاش کیا کچھ کلام ان کے شاگردوں سے حاصل کیا، اس کے علاوہ کچھ کلام ان کے گھر سے بھی ملا جو ان کے دیواروں پر لکھا ہوا تھا جسے پھر قدرت علی خان نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ قدرت علی خان کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے نظام کی کلیات کو عوام کے سامنے لائے اگر وہ اتنی کوشش نہ کرتے تو کلیات کا دستیاب ہونا محال ہو جاتا۔ وہ کلیات نظام کی تقریظ میں رقمطراز ہیں:

دوست احباب کے تقاضے سے بے بس ہزار تلاش و بسیار جستجو سے پرچہ فراہم کیا اور ردیف وار دیوان ترتیب دے کر روح مصنف کو خوش وخرم کیا بود فراہمی دیوان احبابوں کا تقاضہ ہوا پر ہر شخص اس بات پر آمادہ ہوا کہ یہ نسخہ بلاغت اور مجموعہ

فساخت اگر طبع ہوا تو اچھا ہے۔ دوستوں کی تاکید اور احبابوں کے تقاضہ شدید سے
اس دیوان کو ہم نے مطبع شمس المطابع میں چھپوایا۔'' 13؎

کلیات نظام، نظام کی وفات کے ستائیس سال بعد منظر پر آئی۔ نظام کی وفات 1872ء میں ہوئی اور یہ کلیات 1899ء میں طبع ہوئی۔ اس کی اشاعت کی تعداد کم تھی مقامی طور پر بھی نایاب ہونے کے در پہ ہے۔ اس کلیات میں مختلف شعرا نے تقریظیں اور تاریخ قطعات لکھے جو کلیات کے آخر میں موجود ہیں۔ احسان رامپوری کے شاگرد داغؔ کا قطعہ ملاحظہ فرمائیں۔

ہے یہ دیوان نظام شاعر شیریں زباں
کیوں نہ ہو مسرور پڑھ کر اس کو سارے خاص و عام
طبع کی تاریخ میں احساس جو میں نے فکر کی
آئی ہاتف کی صدا سرمایہ اوج نظام

نظامؔ رامپوری کے کلیات کی ابتدا میں امیر اللہ تسلیم لکھنوی کی تقریظ ہے۔ یہ کلیات 296 صفحات پر مشتمل ہے۔

نظام کی مثنوی:

نظام کے پاس ایک مثنوی تھی جس کا نام افضل نامہ تھا جسے نظام نے اپنے کسی دوست کو نظر ثانی کرنے کے لئے دی، یا انھوں نے خود لکھی اس کا ابھی تک کوئی خاص پتہ نہیں چل سکا ناچیز نے بھی تلاش کی لیکن میری رسائی بھی وہاں تک نہ ہو سکی۔ عبدالشکور اپنی کتاب نظام رامپوری میں مثنوی کے بارے میں قیصر شاہ کا بیان پیش کرتے ہیں:

''نظام نے کم و بیش 800 اشعار پر مشتمل ایک مثنوی کہی جس کا نام انھوں نے افضل نامہ رکھا تھا اسے وہ حیدر آباد بھیجنا چاہتے تھے مگر چند در چند سیاسی مصلحتوں کی بنا پر نہ بھیج سکا کچھ عرصہ تک وہ نظام کے پاس رہی پھر ایک دوست اس کے دیکھنے کے لئے لے گئے اور آسانی سے واپس کرنا بھول گئے۔ اب اس مثنوی کا کہیں پتہ نہیں چلتا اس لیے اسے معرض بحث میں لانا عبث ہے۔'' 14؎

نظام کے شاگرد

صاحبزادہ صفدر علی خان صفدرؔ:

صاحبزادہ صفدر نظاؔم رام پوری کے شاگرد تھے۔فنون لطیفہ سے ان کو دلچسپی تھی، وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے ان کی ایک کتاب داستان فن 1891ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپی۔ان کے والد کا نام نواب محمد سید خان تھا جو بہادر والی رام پور نواب کلب علی خان کے چچا تھے۔صفدر علی فارسی اچھی جانتے تھے،اس کے علاوہ خوش نویس اور فن مضمون نگاری میں مشاق اور مصوری میں شہرآفاق تھے۔ان کا شمار ریاست رامپور کے باکمال فن کاروں میں ہوتا ہے۔یہ نظام رامپور کے عزیز شاگردوں میں سے تھے اور ان کی مدد کرنے والے ثابت ہوئے۔یہ قدم قدم پر رہنمائی کرتے اور اچھے مشورے بھی کرتے تھے۔نظاؔم کو شراب چھوڑنے کا مشورہ انھوں نے ہی دیا۔امیر مینائی انتخاب یادگار میں ان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''پہلے امداد حسین فروز مرادآبادی کے شاگرد تھے پھر سید نظام شاہ کو کلام دکھایا۔
جب سے انھوں نے رحلت کی امیر احمد علی رسا کے تلمذ اختیار کی۔'' 15

مبارک علی خان عاصی:

نظام کے قریبی شاگردوں میں ایک خاص نام صاحبزادہ مبارک علی خان عاصی کا ہے،ان کے والد کا نام نواب محمد سعید خان والی رامپور تھا۔امیر مینائی ان کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''عاصی صاحبزادہ محمد مبارک علی خان بہادر ابن نواب محمد سعید خان صاحب بہادر جنت آرام گاہ نور اللہ مرقدہ جن کا ذکر خیز طبقہ والیان ملک میں زیب افزائے تذکرہ ہوا۔اکیس برس کی عمر میں ذہن رسائی اور مذاق اچھا ہے پہلے مرزا محسن علی خان عرف آغا جو متخلص بہ ھندی کے شاگرد تھے۔پھر سید نظام شاہ سے مشورہ ہوا۔'' 16

ان کے کچھ اشعار نمونہ کے طور پر یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

یوں بھی کوئی مکرتا ہے لیکر کسی کا دل
میری طرف تو دوستم ایجاد دیکھنا

یہاں گنتے کٹی ہے ایک ایک گھڑی
وہاں یاد بھی اپنا وعدہ نہیں
ایسی ہرجائی کیجئے ہو جائیں فدا
کر کے بسمل مجھ کو محو تماشہ ہو گئے
جفا وجود میں پائی ہیں لذت کیا کیا
تمہارے ظلم کا کوئی مزہ مجھ سے
حال دل اسلئے اس شوخ سے کہتا نہیں
کہ ستم سے کہیں اپنی پشیمان ہو جائے
ہم سے عاصیؔ کہیں تمہیں دیکھا
کھل گئی قدر پارسائی کی

ساکتؔ امروہوی:

آپ کا نام ساکت تھا۔ابتدائی تعلیم مولوی ابوالحسن صاحب سے امروہہ میں حاصل کی،آپ کے والد حکیم عبدالصمد صاحب امروہہ کے قدیم شرفاء میں شامل تھے۔عربی فارسی کے جید عالم ساکت صاحب نے بھی اپنے والد صاحب سے ہی عربی اور فارسی پڑھی تھی،اس کے علاوہ فارسی کی تعلیم رام پور کے علماء سے بھی حاصل کی رامپور میں حکیم محمد حسین صاحب سے زیادہ قریبی تھی انہیں سے فارسی کی تعلیم لی،علم عروض کے ساتھ قوافی میں اچھی جانکاری رکھتے تھے۔ساکت امروہوی کا حافظہ بہت مضبوط تھا۔اگر کہیں کوئی مسئلہ پیش آتا تو اس مسئلہ سے متعلق بیسیوں مثالیں پیش کر دیتے تھے دین کی اچھی جانکاری تھی ۔ساکت کی اچھی تقریر کیا کرتے تھے اور خطابت کا انداز بھی لائق تحسین ہوتا ساکتؔ کا شمار نظاؔم رامپوری کے قریبی شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔

لالہ سری رام ساکتؔ امروہوی کے متعلق لکھتے ہیں

''آپ فن سخن میں حضرت نظاؔم رامپوری ارشد تلامذہ تھے۔مگر افسوس ہے کہ زمانے کے انقلاب سے ہمیشہ زاویہ گمنامی میں رہے،اور کلام کی شہرت نہ ہوئی

۔''17

ساکتؔ امروہوی کوکئی علوم وفنون میں مہارت حاصل تھی۔لیکن عوام کے درمیان جوانہیں شہرت ملی وہ ان کی شاعری کی وجہ سے ملی شاعری میں غزل قصیدہ مخمس ریختی مسدس میں انہوں نے طبع آزمائی کی لالہ سری رام اپنی کتاب خانہ جاوید میں ساکت کے تعلق میں ایک نئی چیز کا انکشاف کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں

''کہ ساکت امروہوی ،مسدس ریختی غزل قصیدہ لکھنے کے بعد ایسا کلام ہمیشہ دوسروں کو دے دیتے تھے۔''18

ان کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ علمی معرکہ آرائیوں میں اکثر غالب آتے تھے۔اپنے شاگردوں کو اصلاح دینے کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے ،اور اپنے شاگردوں کو ہر طریقے کی مدد کرتے اور قدم قدم پر انکی حوصلہ افزائی کرتے۔ساکت کے متعلق ایک واقعہ یہ بھی درج ہے کہ ساکت نے والی ادے پور، کی شان میں کچھ قصیدے لکھے اور جب یہ قصیدہ ان کے پاس بھیجے تو دربار سے ساکت کو بلاوا آیا پھر قصیدہ نگار کی حیثیت سے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔اور وہاں جانا مناسب نہ سمجھا رامپور اور امروہہ میں ساکت کی بہت زمین جائداد تھی ،دونوں جگہ پر لیکن یہ زمین بیچ کر بہت خسارے میں ہوگئے اور آخری وقت میں خالی ہاتھ ہوگئے اور مفلسی کا شکار ہو کر رہ رگئے۔

ساکتؔ امروہوی کو مرغ بازی کا بہت شوق تھا۔الگ الگ نسل کے مرغے پالا کرتے تھے۔اور بازاروں میلوں ٹھیلوں میں مرغوں کی لڑائی میں حصہ لیا کرتے تھے۔اور جس کے مرغے جیت جایا کرتے،اس کو انعام سے نوازا جاتا تھا۔بدایوں میں ہر سال بازار مئی کے مہینے میں لگا کرتی۔اس بازار میں بہت دور دور سے لوگ اپنے اپنے مرغے لےکر آیا کرتے،اور مرغوں کی آپس میں لڑائی ہوتی،جس کے مرغے جیت حاصل کرتے تھے اسی کو انعام سے نوازا جایا کرتا تھا۔اس میں اکثر ساکت امروہوی کے مرغے جیت حاصل کیا کرتے تھے۔

ان کی شاعری کا نمونہ مندرجہ ذیل ہے۔

وہ یہ کہتے ہیں کہ تو کیا اور تیری تقریر کیا
میں یہ کس منہ سے کہوں کر تو ہو یہ تقریر کیا
دل پہ دزیدہ نظر کیا کاری لگے

اے میرے ناوک فگن ٹوٹی کماں کا تیر کیا

رنگ شوخی کے سبب کوئی ٹھہرتا ہی نہیں
صفحہ قرطاس پر کھینچوں تیری کیا
رکھا ہے غیر کے زانو پہ دیکھیں آپ سرکس کا
جنہیں اپنا سمجھتا ہوں وہی اپنے نہیں ساکتؔ

دل و جاں گر نہیں اپنے تو پھر ہوگا جگر کس کا
شفق نے رنگ اڑایا تیرے دست حنائی کا
شعاع مہر نے پرتولیا گوری کلائی کا
رکاوٹ ہے تیرے جانب سے دل میں اے قاتل
کہ تیری تیغ بھی دم بھر رہی ہے کج ادائی کا
طریق عشق میں دونوں کے دعوے ہیں برابر
ہمیں ہے آشنائی کا انہیں نہ آشنائی کا

غیر جب بزم مختار بنے بیٹھے ہیں
آپ کس بات پر سرکار بنے بیٹھے ہیں
جس قدر ہم پے ترے جور و جفا ہوتے ہیں
کبھی کیا ہوتے ہیں وہ اور کبھی کیا ہوتے ہیں
بھول جاتے ہیں خدا کو بھی بتوں سے مل کر
بت نہیں ملتے تو ہم یادِ خدا کرتے ہیں

ایک چپ سو کو ہراتی ہے مثل ہے ساکت
فائدہ ہم نے بھی سوچا ہے یہ خاموشی میں

دبے پاو ں وہ آئے فاتحہ خوانی کو مرقد پر
چھوا پھر ناز سے میرا مزار آہستہ آہستہ
وہ اس انداز سے آئے شب وعدہ میرے گھر پر
چمن میں جیسے آتی ہے بہار آہستہ آ ہستہ

ساکتؔ امروہی غزل گوئی میں یکتا تھے حسن اور عشق کی باتوں کو اپنی غزل میں نہایت خوبی سے نظم کرتے تھے، بیان بے تکلفانہ ہوا کرتا تھا۔ اپنی غزل میں تخیل اور دلی واردات کو جامہ پہناتے میر کرامت علی بخش اجمیری و مولوی غلام نبی شاعر ابتدا میں ساکت کے شاگرد تھے 1895ء ساکت کی وفات ہوئی۔

منور شاہ منورؔ:

نام منور شاہ تخلص منور ولدیت سید احمد شاہ یہ رشتے میں نظام کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ابتدائی تعلیم رام پور کے محلّہ گھیر سخی کے ایک مکتب میں حاصل کی تھی۔ جیسا کہ اس وقت کا ماحول تھا کہ بچے مکتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے یہ صوفی قسم کے انسان تھے۔ عربی و فارسی سے اچھی واقفیت رکھتے امیر مینائی کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی شاعری کے استاد نظام رامپوری تھے شاعری میں اپنے بڑے بھائی نظامؔ رامپوری سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا بھی پیشہ اسپ سواروں میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ نظامؔ رامپوری نہ صرف ان کے بھائی تھے بلکہ ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی رکھتے، افسوس کی بات یہ ہے کہ منور شاہ جوانی ہی میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ جس کی وجہ سے نظامؔ رامپوری کو بڑا دکھ ہوا، جس کا اثر ان کی غزلوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

نمونہ کلام

یہ راز دوستوں سے بھی کہنا تھا مجھے
دشمن سے اس کا شکوہ کیا میں نے کیا کیا

غلام احمد تمیز:

نام غلام احمد تخلص تمیز تھا۔نومسلم تھے۔اوران کا نام اصلی نام رام دیال تھا پیدائش ۱۲۳۲ھ میں ہوئی تھی ان کا مکان رامپور کے محلّہ گوجرو میں واقع تھا انہوں نے بیس برس کی عمر میں اسلام قبول کیا یہ نظاؔم رامپوری کے خاص شاگرد تھے۔ایک دفعہ ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔اوراس حالت میں نظاؔم رامپوری انہیں اپنے پیر کے پاس لے گئے ،وہ میاں احمد علی شاہ کے مرید تھے انہوں نے انہیں کلمہ پڑھا کر اسلام میں داخل کیا اوراسلام کے ارکان سے متعارف کرایا نظام کو ذمہ داری دی کہ نظام تم ان کے نماز واسلام کے ارکان یاد کراو گے میاں احمد علی شاہ جو نظاؔم رامپوری کے مرشد تھے۔انہوں نے ان کا نیا نام غلام احمد رکھا تخلص تمیز انہوں نے خود رکھ لیا۔

حافظ احمد علی شوق نے تذکرہ کاملان رامپور میں تمیز کا نظام کی شاگردی کا ذکر کیا ہے۔

''استاد تو بظاہر نہ تھا مگر شوق طبیعت نے راہبری کی میاں نظام شاہ نظاؔم سے شاگردی کی برائے نام تعلق تھا ''19

تمیز شاعر نے نظاؔم کے علاوہ داغ دہلوی سے بھی مشورہ سخن لیتے رہے ان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ عرس میں قوالی پیش کرنا،اوراپنے پیرومرشد کی خدمت کرنا رام پور سے حیدرآباد کا انہوں نے سفر کیا اور حیدرآباد میں ملازمت کی اللہ تعالی نے جب سامان سفر فراہم کردیا تو حج کی زیارت کو بھی گئے۔اور جب وہاں سے واپس آئے تو رامپور میں قیام کیا اور محلّہ کھنڈ سار قدیم میں ان کا مکان تھا جو انہوں نے اپنی جوانی میں خریدا تھا۔

دینداری ان کی رگ رگ میں بسی تھی۔صوم وصلاۃ کے پابند تھے عشرہ محرم میں دس دن مسلسل روزہ رکھتے عشرے کے دن صبح کی نماز کربلا میں جا کر پڑھتے اور عصر کی نماز پڑھ کر واپس آتے جب ان کی وفات ہوئی مرشد جناب مہربان علی خان صاحب بہادر نے ان کی قبر اپنے ہاتھ سے کھودی تدفین ان کے مکان جو محلّہ کھنڈ سال میں واقع ہے جو جناب کا ذاتی مکان تھا اس میں دفن کیا گیا ان کی قبر پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

تھے وہ حامی غلام احمد تمیز

بہت لوگ ان کے مرید ہوئے آخری خواہش تھی کہ اپنی مرشد کے مزار میں دفن ہو لیکن وہاں دفن نہ ہوسکے ان کے مریدوں کی تعداد اس وقت رامپور میں کافی تھی۔

نمونہ کلام:

تمیز اب ہو گیا کیسا ہماری باطن وظاہر
سیاہی دل کے اندر تن پہ بھی پوشاک کالی ہے
ناز تقریر پہ ہو کیوں نہ خدایا مجھ کو
کہ محمد صل وسلم نے مدینے میں بلایا مجھ کو
تنگ دستی کی چلی نا پیش نہ کچھ ضعیف کا زور
پر لگا کر میری قسمت نے اڑایا مجھ کو
لوگ کس طرح کرتے ہیں خدا کو راضی
مجھ سے تو اک بت کافر بنایانہ گیا
ہر ایک بلبل میں ہے شان ایسی
کہ ہر غنچہ میں ہے بوئے محمد
مقتل میں بعد قتل بھی ہے قتل کی ہوس
پھرتی ہے روح یار کے خنجر کے آس پاس
روز دو چار امیدوں کے گلے گھٹتے ہیں
کوئی مقتل میرے پہلو میں ہے یا دل کا قاتل
بے وفائی سے بھی خوش ہوں یار کی
ہر کسی کا آشنا ہوتی نہیں

حمید شاہ سوز:

نام سید حمید شاہ تخلص سوز ولدیت سید محمد شاہ نظام کے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں عمر میں نظام رامپوری سے چھوٹے ہیں انہیں شاعری کا شوق نظام کی صحبت میں رہنے سے اجاگر ہوا ان کے تعلق سے امیر مینائی انتخاب یادگار میں لکھتے ہیں۔

''سید حمید گل شاہ ولد سید حافظ محمد شاہ بتّیس برس کی عمر میں مولوی منصور علی کے
شاگرد ہیں۔''20

امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں ان کا ذکر کیا ہے مگر نظام کی شاگردی کا ذکر انہوں نے نہیں کیا ہے۔حافظ محمد شاہ ولدیت کی وجہ سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ یہ نظام کے حقیقی چچازاد بھائی ہیں۔امیر مینائی نے ان کا ذکر کیا ہے مگر نظام کی شاگردی کا ذکر انہوں نے نہیں کیا ہے۔اور شاعری بھی کیا کرتے تھے۔کلیات نظام میں کلب فائق علی نے نظام کا شاگرد بتایا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''میری رائے میں ابتدائے شباب سے سوؔز نے شعر گوئی میں حصہ لیا اور نظام سے
اصلاح لی نظام کے مرنے کے بعد سید منصور علی رعلی تخلص سے اصلاح لینے لگے
۔''21

فائق صاحب نے نظام کی شاگردی کا ذکر کیا اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔کیونکہ یہ نظام کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔ان سے نظام کا خاندانی رشتہ ہے۔

نمونہ کلام

ایک نشانی کا رہو ممنون میں
میرے سینے سے نہ اپنا تیر کھینچ
چشم می کو کسی کی یاد آئی
اب نہ دے ساقیا کی شراب مجھے

احمد نور خاں،مکدّر

نام احمد نور خاں تخلص مکدّر ولد محمد حسمد خان ان کی پیدائش رامپور میں ہوئی ابتدائی تعلیم رامپور میں حاصل کی شعروشاعری کا شوق جوانی میں آیا ذیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔

ان کے تعلق سے امیر مینائی انتخاب یادگار میں کہتے ہیں

''میاں نظام شاہ مرحوم کے شاگرد ہیں 1290ھ میں بیس برس کی عمر ہے''۔22

نمونہ کلام

کیا جانیے کیا ہو تیرے بیمار کی حالت
گزری جو اسی طور سے دوچار پھر آج
چھپ کی الہی آنکھ کہیں اضطراب میں
جاگیں میرے نصیب جوآئیں وہ خواب میں

یعقوبؔ:

نام محمد یعقوب تخلص یعقوبؔ ولد شیخ لطف اللہ ان کی رامپور کے محلّہ گھیر سخی میں ولادت ہوئی ابتدائی تعلیم رامپور کے مکتب سے حاصل کی نظامؔ کے ساتھ ان کے ابوّ کا بہت اٹھنا بیٹھنا تھا۔ نظامؔ کے رشتے داروں میں ان کا شمار ہوتا تھا

ان کے تعلق سے امیر مینائی لکھتے ہیں۔

''بائیس برس کی عمر ہی میں نظام شاہ نظام مرحوم سے چندروز اصلاح لی ہے۔'' 23

نمونہ کلام:

وہ ہنس ہنس کے یوں پوچھتے ہیں
یہ کس کی تجھے تیغ آبرو نے مارا
اس بت کو میرے حال پہ آیا نہ کبھی رحم
اللہ میری آہ میں کچھ بھی اثر نہیں

محمد بشیر خان، بشیرؔ

نام محمد بشیر خان تخلص بشیر ولد جمال شاہ ان کے والد یعنی مولوی جمال اللہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کے والد رامپور میں دین کی تبلیغ کی غرض سے آئے تھے۔ اس زمانے میں عزت وشرافت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رام پور کی عوام میں ان کا بلند و بالا مقام اور مرتبہ تھا بشیر خان زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے فطری موزونیت بھی تھی۔ خاندان کے سب افراد پڑھے لکھے ہوئے عزت و باوقار لوگ تھے۔ جب انہیں شاعری کا شوق ہوا تو لوگوں نے ان کو

بتایا کہ نظام رامپوری سے ملاقات کروں وہ آپ کو شاعری کا طریقہ بتائیں گے لوگوں کے بتانے پر انہوں نے نظآم رامپوری سے خصوصی ملاقات کی اور ان کی شاگردی حاصل کی ۔انتخابِ یادگار میں امیر مینائی کچھ اس طریقے سے ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''بشیر محمد عرفان ولد مولوی جمال شاہ 31 برس کا سن ہی میاں نظام شاہ کے شاگرد میں ذی اعتبار ہیں۔'' 24

نظآم رامپوری کی وفات کے بعد بشیر خان صاحب نے نظآم رامپوری کی علاوہ داآغ دہلوی سے بھی اصلاح لی۔ جب داآغ دہلوی رامپور ترک کر کے حیدر آباد آئے تو یہ بھی داآغ کے کے ہمراہ چلے آئے داآغ دہلوی کے ممتاز شاگردوں میں ان کا ذکر ہوتا ہے۔نظآم رامپوری کے دیوان میں ان کی وفات کے بارے میں کچھ اس طریقے سے لکھتے ہیں۔

''بیسوی صدی عیسوی کی آغاز میں انتقال ہوا'' 25

اس بت کا عشق میری ہی قسمت میں تھا اگر
پتھر کا دل بھی کیوں نہ دیا یہ اے خدا مجھے
برسوں میں ہم نے دیکھی تھی شکل شب وصال
اے صبح تجھ کو آج ہی آنا تھا شام سے
آج کیا حال ہے آپ ہم سے تو چھپاؤں نہ بشآیر
دونوں ہاتھوں سے سنبھالے کہو ں اے دل

چھبیلے لال بہآدر:

چھبیلے لال بہار یہ نظام کے شاگرد تھے۔ان کا نام اصل نام چھبیلے لال تخلص بہآدر خلف حکیم مملوک چند تھا۔ ان کی پیدائش رامپور میں ہوئی اور رام پور ہی میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی شروع سے ہی اردو شعر و شاعری سے شغف تھا۔ نظام کے ساتھ ان کے بہت اچھے مراسم تھے۔نظآم کے علاوہ بھی انہوں نے ابتدائی تعلیم مکتب سے

حاصل کی تھی۔

ان کے بارے میں امیر مینائی انتخاب یادگار میں لکھتے ہیں،

''بہار تخلص لالہ چھبیلا نام حکیم ملوک چند کے فرزند شاگرد میاں نظام شاہ نظاؔم ۴۵ برس کی عمر ہے''26ۓ

نمونہ کلام

آرائش اس کی دیکھو تو کیا حال ہوا مرا
بگڑ ی ادا نے اس کی تو وحشی بنا دیا
دل عشق کے لینے کے لیے کیا کیا نہیں ان میں
ادا ہے ناز ہے غمزدہ ہے شوخی ہے شرارت ہے

..شریف احمد شریفؔ:

نام سید شریف احمد تخلص شریفؔ ولد سید محسن علی نظاؔم رامپوری کے حقیقی بھانجے تھے۔ نظاؔم رامپوری کی چھوٹی بہن جن کا نام بیگم جان تھا یہ ان کے صاحبزادے تھے۔ شروع سے ہی نظاؔم رامپوری سے اصلاح لیتے رہے، نظاؔم رامپوری کے ذہین شاگردوں میں ان کا شمار ہوا کرتا تھا، سب شاگردوں میں نظاؔم رامپوری کے سب سے زیادہ قریبی تھے، یہ اکثر نظاؔم رامپوری کے ساتھ رہا کرتے تھے، ہر طریقے سے نظاؔم رامپوری کی مدد کیا کرتے تھے، جب تمام لوگوں نے نظاؔم رامپوری کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ تو یہ نظاؔم رامپوری کے شانہ بشانہ رہا کرتے ہر مصیبت کے وقت میں یہ نظاؔم رامپوری کی حوصلہ افزائی کرتے نظاؔم رامپوری نے اپنی شاعری میں بھی اس چیز کو بار بار دہرایا ہے۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم رام پور کے محلے سے حاصل کی ہوگی جیسا کہ اس وقت کا ماحول تھا کہ جگہ جگہ مکتب تھے۔ اور بچے پڑھنے آیا کرتے تھے لیکن جب یہ تھوڑے سے ہوشیار ہوئے تو یہ نظاؔم رامپوریؔ سے درس لیا کرتے، ابتدائی تعلیم انہوں نے مکتب کے علاوہ نظاؔم رامپوریؔ سے بھی حاصل کی ہے۔ عربی فارسی کے اچھے انکار تھے، شعر و شاعری میں نظاؔم رامپوریؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے، اور ان کا کلام نظاؔم رامپوری کے کلام سے ملتا ہے۔ دونوں کا انداز سخن آپس میں یکساں ہیں۔

نمونہ کلام

گلشن میں صبا جنبش شاخ گل تر سے
آتا ہے مجھے یاد رکھنا وہ کمر کا
بے تکلف رات دن رہتی ہے اس میں جلن گر
دیدہ مجنوں مگر لیلا کا محل ہوگیا

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔نظام رامپوری حیات اور شاعری مرتب ڈاکٹر شعائراللہ خاں وجیہی ص48

2۔انتخاب یادگار از امیر مینائی ص386

3۔تاریخ ادب اردو جلد چہارم از ڈاکٹر جمیل جالبی ص492

4۔نظام رامپوری از پروفیسر عبدالشکور ص4

5۔انتخاب یادگار از امیر مینائی ص54/55

6۔ایضاص181

7۔نظام رامپوری از پروفیسر عبدالشکور ص10/11

8۔مقدمہ کلیات نظآم مرتبہ کلب علی خاں فائق ص64/65

9۔کلیات ناظم مرتبہ ذکیہ جیلانی ص16

10۔۔مقدمہ کلیات نظآم مرتبہ کلب علی خاں فائق ص68

11۔مکاتیب ومضامین شاد عارفی مرتبہ پروفیسر مظفر حنفی ص329

12۔نظام رامپوری از پروفیسر عبدالشکور ص23

13۔ایضاص54

14۔نظام رامپوری از پروفیسر عبدالشکور ص16

15۔انتخاب یادگار از امیر مینائی ص203

16۔ایضا215

17۔تذکرہ ہزار داستان المعروف خانہ جاوید از جناب لالہ سری رام صاحب چہارم ص35

18۔ایضا35

19۔تذکرہ کاملان رامپور از حافظ احمد علی خاں ص281

20۔انتخاب یادگار از امیر مینائی ص175

21۔ مقدمہ دیوان نظام مرتب کلبِ علی فتح علی خاں ص78

22۔۔انتخاب یادگار از امیر مینائی ص401

23۔ایضا401

24۔ایضاص 63

25۔دیوان کلیات از کلب علی خان فائق ص75

26۔انتخاب یادگار از امیر مینائی ص75

باب سوم: نظامؔ رامپوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

نظاؔم رامپوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

نظاؔم رامپوری دبستان رامپور کے اہم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ان کی شاعری میں تغزل معاملہ بندی اورتصوف کے ساتھ عشق حقیقی، وعشق مجازی، کا عنصر پنہا ہے۔دلی ولکھنو کے دبستان کی ممیّزات ان کی شاعری کے حسن کودو بالا کرتے ہیں۔یہ اردو کے بڑے شعراء کے روش پر ہیں۔ان میں، ولؔی،میؔر،غالبؔ اور دردؔ ہیں ان کی غزلوں میں عشقیہ بیان کی کثرت ہے

نظاؔم رامپوری نے اپنی غزلوں میں ہجر وصال کو خاص جگہ دی ہے کیونکہ ہجر وصال کی کیفیت ہر محبت کرنے والا دوچار ہوتا ہے۔۔ان کا کہنا ہے کہ بلا شبہ ایک مطلوب اپنے محبوب کے ہجر میں جو پیچ وتاب کھا تا ہے۔دردناک ہے،لیکن اس ہجر کی وجہ سے اس کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔اور وہ وصال کی خواہش بار بار کرتا ہے،لیکن جب وصال کا وقت یا موقع نزدیک ہوتا ہے۔تو محبوب اور بے قرار رہتا ہے،ہجر ووصال کا منظر جو نظاؔم نے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔لاجواب ہے ان کا اسلوب عام فہم ہے جو قارئین کی فہم وفراقت میں بہت تیزی سے جگہ بنالیتا ہے۔

معشوق کا فراق اور عاشق کا اس سے جدا ہو جانا ایک منتقل کیفیت ہے۔ہجر وصال معشوق کی ایک مستقل کیفیت کی علامت ہے جس سے ہر عاشق دوچار ہوتا ہے۔وہ عشق میں ایک ایسے وقت کو گزار رہا ہوتا ہے جو بہت کٹھن ہے۔یہ تصور اردو شاعری کا بہت بنیادی تصور ہے شاعروں نے غمزدہ فراق کی اس کہانی کو بہت طویل دیا اور نئے انداز میں نئے مضامین پیدا کیے ہیں جدائی کے لمحات سے اکثر لوگ گزارتے ہیں۔

مگر نظاؔم رامپوری نے اس انداز سے اس کو پیش کیا ہے کہ ہجر ایک ایسی چیز ہے جس کے غم سے موت بھی

آسکتی ہے اور وہ جو ہجر کا وقت تھا وہ ہمیشہ آنکھوں میں موجود رہتا ہے۔اور یہ حقیقت بھی کہ جب انسان کی کسی سے دوری ہوتی ہے تو ہمیشہ آخری وقت اس کی آنکھوں میں رہتا ہے۔اس کے بعد آدمی چاروں طرف حسرت سے اپنے محبوب کو دیکھتا ہے۔

جب محبوب سے دوری بڑھ جاتی ہے، زمانے یا وقت کے اعتبار سے تو اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے، کہ میرا جوا تنا خراب حال ہے۔پھر اس کے دماغ میں پورانی یادیں بس جاتی ہیں اور دل میں محبوب کے لیے محبت اُجاگر ہو جاتی ہے۔اس چیز کا نقشہ کھینچا گیا ہے ان کی غزلوں میں جس کا ذکر جناب باقر شمش نے کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''کی صورت حسن، حال، ڈھال، زیور بناؤ سنگار، پر مرد فریفتگی، اس سے ملنے کی آرزو، اس سے وصل کی تمنا، اس کو لذتیں، ہجر کی اذیتیں، یہ عورت سے کسی اور طرح کی محبت سے انکار کرتی ہے۔مرد عورت پر اسی وجہ سے فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے جنسی خواہشیں پوری کرنے کا مشتاق ہے حسن محض عشق کا سبب نہیں ایک حسینہ کسی کی بیٹی اور بہن بھی ہے مگر اس کا حسن و جمال اس کے باپ اور بھائی کے لیے غزل کا موضوع نہیں اس کا سبب وہی ہے کہ ان کے درمیان جنسی خواہشیں کا دخل نہیں، مگر وہی حسینہ اپنے محبوب کے لیے قیامت ہے اور غزل میں اس کی ہر چیز ادا کے بلائے جان سونے کی عجیب عجیب تشبیہیں اور استعارے ہیں، دنیا کی جتنی چیزیں انسان کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتی ہیں وہ عورت کے کسی وصف ذاتی ناانصافی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔''1؎

زیست سے ہاتھ اٹھائے بیٹھے ہیں
عشق کا تیر کھائے بیٹھے ہیں
درد دل میں اٹھا اف نہ کریں
راز الفت چھپائے بیٹھے ہیں
چشم گریاں یہ کس پوچھے اشک
دیکھ تو کون آئے بیٹھے ہیں

شرم سے بات کر نہیں سکتے
چپ وہ گردن جھکائے بیٹھے ہیں
کوئی مطلب کی بات کہہ نہ سکے
بگڑی صورت بنائے بیٹھے ہیں
دور ہم بیٹھے منھ کو تکتے ہیں
غیر پاس ان کے آئے بیٹھے ہیں
بزم میں اور سب سے باتیں ہوں
گویا ہم بے بلائے بیٹھے ہیں
آج منظور کیا ہے انکو نظام
آستیں چھڑائے بیٹھے ہیں

متذکرہ بالا اشعار میں نظاؔم رامپوری نے اپنی شاعری میں عشقیہ بیان کو پیوست کیا ہے۔معشوق کی بے رخی، اور عاشق کی بیقراری،اس غزل میں دیکھنے کوملتی ہے۔شاعر ایک پرانے خیالات کی طرح یہ کہہ رہا ہے، عشق جیسے زخم کو ہم نے کھایا ہے۔جس کی وجہ سے زندگی اب محال سی لگ رہی ہے۔ان کا یہ مصرعہ دیکھنے میں مصرع چھوٹا سا معلوم ہوتا ہے۔زبان سادہ اور عام فہم ہے۔لیکن کہیں کہیں یہ مصرع ان کو بڑے شاعروں کی فہرست میں لا کھڑا کرتا ہے۔ جیسے ولی کا یہ شعر

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

غزل کے دوسرے مصرع میں میں ایک یکسانیت موجود ہے۔جس میں وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ عاشق اپنے معشوق کے سامنے عاجزی وانکساری کا اظہار کر رہا ہے۔اور معشوق ہے کی اپنی توجہ عاشق کی طرف سے مبذول ہی نہیں کرتی ، وہ اپنی وقعت کو خود ہی جانتا ہے۔اس کی نظر میں میری وقعت کچھ بھی نہیں ، بلکہ ہم سے زیادہ تو غیر اس کے قریب ہیں۔ہماری حیثیت یہ ہے کہ ہم اس سے تو بات بھی نہیں کر سکتے ،اور کوئی خاص بات کہہ بھی نہیں سکتے ،جس کی

وجہ سے عاشق پر الگ الگ طرح کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔کبھی شکل کا بگڑ جانا اداس ویسے یہ غزل نظاؔم رامپوری کی اورغزل کی طرح ہی یہ معنی خیز ہے۔اس میں عشق کی سرسری داستان کو بیان کیا ہےلیکن مصرع اولیٰ سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کوکلاسکیت کی طرف لے جاتا ہےغزل کے اشعار میں نظاؔم رامپوری نے اپنی بے بسی کا اظہار کر کے اپنے محبوب سے ان باتوں کا شکوہ کیا ہے، کہ میں نے اپنی زندگی کی پرواہ چھوڑ دی ہے کیوں کہ عشق میں اس قدر فراق زدہ ہے،اور مایوس ہے کیوں کےمحبوب کا بار بار سامنا کرنا پڑ رہا ہے، میں نے اپنی گردن جھکالی ہےاور مناسب نہیں سمجھتا میں اپنی زبان سے بتاوں کہ میں یہاں ہوں اورحال دیوانے کی طرح ہے یوں توبظاہر بزم میں ہوں لیکن حقیقتا تنہامحسوس کرر ہاہوں۔

میں حال دل ان سے کہہ رہا ہوں
وہ کہتے ہیں تجھ سے میں خفا ہوں
ملنے سے تیرے یہ کچھ ڈرا ہوں
دشمن کی بھی خیر مانگتا ہوں
جو چاہے تو ظلم کر سہوں گا
ائے جان میں تجھ کو چاہتا ہوں
کیوں آنکھوں چراتے ہو سمجھ کہ
میں کبھی تمہیں ہی دیکھتا ہوں
جاتے ہوئے کچھ مجھے تو سونپو
میں تمکو خدا کو سونپتا ہوں
شربت یہ تو آوٗ ایک دم کو
دوری میں تماری مر رہا ہوں
تم بھی تو ذرا ادھر کو دیکھو
میں دیر سے تمکو دیکھتا ہوں

اس غزل میں نظام رامپوری نے عاشق و معشوق کی کلماتی گفتگو کو اس انداز سے پیش کیا ہے، کہ عاشق اور معشوق اپنے دل کی بات کو اس طرح بیان کرر ہے ہیں جیسے کہ وہ آمنے سامنے بیٹھے ہوں، ویسے تو یہ رو یہ رہا ہے۔ کہ معشوق کچھ نہیں بولتا عاشق اپنی زبان سے اپنی چاہت اور بے قراری کے ساتھ معشوق کی خاموشی کو بے توجہی کا نام دے کر بیان کرتا ہے۔ یہ چیز پہلے مصرعے میں دیکھ سکتے ہیں، جس میں عاشق اپنے دل کی بات اپنے معشوق سے کہہ رہا ہے۔

میں حال دل ان سے کہہ رہا ہوں
وہ کہتے ہیں میں تجھ سے خفا ہوں

نظآم رامپوری اس غزل میں عاشق کے عشق کی شدت کو بیان کیا ہے اور شدت بھی اس درجے کی ہے عاشق معشوق کی طرف متوجہ ہو کر کہتا ہے۔ کہ میں تمہاری محبت میں اس قدر گرفتار ہوں۔ کہ تم چاہو ظلم کرو چاہو بے رخی کا پیشہ اختیار کرو، یا مجھ سے اپنی نظریں چراؤ جو بھی طریقہ اختیار کرنا چاہو کرو، میں تمہارے ظلم کے تمام طریقے کو سہوں گا۔ بس ایک ہی وجہ ہے۔ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں ساتھ ہی عاشق اپنے دل کی بے قراری او بے چینی کو بیان کرتا ہے ، کہ وہ معشوق سے دوری اسے تکلیف میں ڈالتی ہے، معشوق کی خلاف ورزی عاشق پر اس طرح گراں گزری ہے، کہ وہ ہمیشہ اس بات کا احساس کرتا ہے۔ کہ کسی طرح سے معشوق کے چہرے پر خوشی آجائے ،اور میری ناراضگی کا سایہ ان کے چہرے سے دور ہو جائے۔

جاتے ہوے کچھ مجھے تو سونپوں
میں تم کو خدا کوسونپتا ہوں

ویسے تو اس شعر میں عاشق معشوق سے یہ چاہت رکھتا ہے۔ کہ اگر وہ دوری اختیار کرتا ہے۔ کسی وجہ سے تو اس کی کچھ چاہت ہم پر نچھاور ہو جائے ،اور پھر ہم چاہت اور پیار کو اور چاہت کی عوض میں انہیں اللہ کے سپرد کر دوں، لیکن ان کی دوری کی چاہت اور محبت کے بدلے گزار لوں گا، یہ بھی عشقیہ غزل بیان کی ایک بہترین غزل ہے۔ اس میں عاشق کے جزبات کو سنجیدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ جس میں تلخی اور تصنع نہیں ہے۔ پچھتاوا نہیں ہے جزا، فزا نہیں ہے۔ بلکہ آس وامید پوری طرح برقرار ہے۔ ہر مصرع کو بہترین پیرائے میں ڈھالا گیا ہے۔۔ شاعری کی وصفیت

برقرار ہے غزل میں نظام اپنے محبوب سے مخاطب ہوکر یہ کہتے ہیں کہ میں اپنا حال تم کو بتا رہا ہوں۔آپ کی بے رخی سے میں خفا ہوں ناخوش ہوں۔اور جو آپ مجھ پر ظلم کرنا چاہو،شوق سے کرو لیکن میں آپ سے ہی محبت کرتا ہوں۔مختصرا یہ کہ نظآم پہلے اپنے محبوب سے شکوہ کرتا ہے پھر اسے یہ بتا تا ہے۔آپ نے جو میرے ساتھ ظلم کیا ہے، میں نے سب برداشت کیا، دراصل میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔آپ کے عشق میں بےبس اور لاچار ہوں،

نہ آنے کا اپنے سبب کیا کہوں
ستم غیر کا یا تمہارا کہوں
مجھے قطع امید کا خوف ہے
میں کیا اپنے دل کی تمنا کہوں
نہ پوچھو سبب درد دل کا میرے
برا گر نہ مانو تو اچھا کہوں
ستم میں جب اس کے مزے پائے دل
زباں سے اسے بیوفا کیا کہوں
تماری ندامت کا غم ہو مجھے
جو اپنی شب کا قصہ کہوں
بہت مجھ کو غمگین بنائے ہو آج
جو تم بھی کہو تو میں کیا کہوں
مجھے کیا کہے اور تجھے کیا کہے
کسی سے جو میں حال اپنا کہوں
کہ اے نامہ برحال واں کا کچھ اور
نہ کہہ یہ کہ بس اور میں کیا کہوں
کسی غیر ہی نے کیا ہوگا یوں

ذرا سوچئے تو میں ایسا کہوں
کسی طور پرواں رسائی نہیں
بس اس دل کا کیا میں راہ کہوں
نہ کہنا عدو سے ہی لطف ہے
میں جو تم سے ازراہ شکوہ کہوں
مری تو خطائیں کہیں آپ نے
تمارا بھی کچھ ستانا کہوں
نظاؔم اب تو چپ دیکھتے ہو مجھے
جو میری سنی وہ تو کیا کیا کہوں

متذکرہ بالا غزل میں نظاؔم رامپوری نے محبوب سے جدا ہونے کا خوف اور محبوب جو روٹھ جانے کا حال اس سے معشوق کے حالات اس چیز کا ذکر کیا ہے اور جب تعلقات ختم ہو جائے گا تب میرے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے میں اسے بتا نہیں سکتا۔

لے کے دل تم تو آشنائی نہیں
آپ سا کوئی بے وفا ہی نہیں
اس سے آیا ہوں روٹھ کر ہے
کیا کروں دل تو مانتا ہی نہیں
کیسے دوری کا غم اٹھاؤں میں
دل میں قابو تو کچھ رہا ہی نہیں
جس سبب سے ہے بولنا چھوڑا
وہ بھی اب مجھے بولتا ہی نہیں

جھوٹی باتیں عبث بناتا ہے
ہائے قاصد تو وہاں گیا ہی نہیں
خوب سا ہم نے مل کر دیکھ لیا
بے وفا تجھ میں کچھ وفا ہی نہیں
ہائے ملنا تیرا لگاوٹ کا
دم میں ایسا کہ آشنا ہی نہیں
آپ بھی ہو سکتے ہیں خفا مجھ سے
میں خفا ہوں یہ حوصلہ ہی نہیں
جب سے ملتا نہیں ہے تو ظالم
چین دل کو میرے ملا ہی نہیں
رنج سہنے پھر ہے جی میں نظآم
دل کیسے دیویں دلربا ہی نہیں

نظام نے جو اپنے اشاروں میں دنیا خلق کی ہے۔ اور اپنے جو نئے کردار دیئے ہیں وہ قاری کے لیے ایک خوشگوار تجربہ ہے۔ معشوق، عاشق، ناصح یہ تمام شاعری کے روہانی کردار ہیں، لیکن نظام نے محبوب کی شخصیت کے جن پہلوں کو اُجاگر کیا ہے اور وصال وہجر کی کیفیت کو جس زاویئے سے دیکھا ہے۔ وہ نظام کا ذاتی تجربہ ہے۔ اس غزل میں کرداروں کی گفتگو اور ان کی باہمی ربط وتعلق کی نوعیت زندگی کی حرارتوں سے ایسی معمور ہے۔ کہ قاری بہت دیر تک اس قاصد کی دریافت کرتا رہتا ہے۔ روایتی کرداروں کا غیر روایتی کردار اور جانی پہچانی جگھوں کا استعمال ان کے کلام میں لطف پیدا کرتا ہے۔ ان کی شعری کائنات میں کچھ ایسا نہیں جسے انوکھا کہا جاسکتا ہے۔ لیکن نظام نے اپنے محدود سرمایہ الفاظ کے باوجود جس طرح اس قصے کی جزیات نگاری نئے انداز میں کرداروں کو پیش کیا ہے۔ چناچہ اس کا پورا زاویہ زندگی کے لیے بھی اور عاشق کے لیے بھی عرضی اورانسانی ہے جسمانی مطالبات کا بھی احترام کیا ہے بقول حسن عسکری:

''جوشاعری یا جو محبت جسمانی خواہش کی پاکیزگی محسوس نہ کر سکے وہ وقت اور عظمت سے بھی پاک ہوگی۔۔۔۔اور یہ کہ جنسی خواہش کے باوجود بلکہ جب جنسی خواہش کی مدد سے آدمی محبوب کے حسن میں ہماری کائنات کا حسن دیکھ سکتا ہے''۔2ے

درد کیا تکلیف کیا آزاد کیا
سب سہے پر تم سے ملنا کچھ نہیں
روٹھے ہیں جان سے جائیں گے ہم
اس میں جائے گا تمہارا کچھ نہیں
مجھ سے کیا تم پوچھتے ہو اپنا حال
دیکھ لو تم سے تو پردا کچھ نہیں
ہر کسی پہ دل کا آنا کچھ
دل کا آنا گو مزا رکھتا ہے کچھ نہیں
ہم نے کیونکہ دن گزارے ہجر میں
ایک دن میں تم نے پوچھا کچھ نہیں
ذکر سے میرے ہوگئے بیزار تو
سر گزشت غیر تنہا کچھ نہیں
یہ بھی کہنا کچھ کہا جاتا نہیں
قاصد ان سے اور کہنا کچھ نہیں
غم میں تیرے موت تک آئی نہیں
اور جیوں تو ایسا جینا کچھ نہیں
خوف ہے وہ غیر سے کچھ کہہ نہ دے

حال دل اس کو سنانا کچھ نہیں
روز کہتے ہیں آپ جائیں گے وہاں
یوں کہنے میں یہ ہونا کچھ نہیں
آپ ہی ملتا نہیں میں آپ
غیر کا بھی دل کا سنانا کچھ نہیں
تم ہی منصف ہو کہاں تک کھائے غم
کہنے میں سب زہر کھانا کچھ نہیں
ہوئیں گے دعوے کسی کو اے نظآم
کچھ نہیں میں مجھ کو دعوا کچھ نہیں

ان اشعار سے محبوب کی جو تصویر ابھرتی ہے اس میں نظآم رامپوری نے اپنی فنکاری اور لہجے پر غیر معمولی روایتی مضامین میں ایک نیا پہلو ایجاد کر دیا۔ اسی پرکاری کی وجہ سے مضمون بیان، واقعہ کی سطح سے بلند ہو کر شعری تجربے میں تبدیل ہو جاتا ہے، پھر یہ ایک بڑے حلقے کو متاثر کرتا ہے۔ وہ عاشق سے بلا تکلف ملتا ہے اس سے باتیں کرتا ہے اور اپنے دل کا حال بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم سے بہت محبت ہے اگر تم روٹھ گئی تو ہماری جان چلی جائے گی۔ اسی انداز کو وہ آگے بڑھاتے ہوئے ہجر تک پہنچ جاتا ہے اور ہجر کی کیفیتوں کی ہیئت کے بارے میں اپنے معشوق سے کہتا ہے پھر ضبط کرتا ہے وصل کی لزتوں کو ہجر کی تکلیفوں میں تبدیل کرنے کا قائل ہے اور اس کی زبان میں شوق ہے۔ معشوق سے رخصت کے وقت چھیڑ چھاڑ کو وہ اپنے آداب کے خلاف نہیں سمجھتا ہے انھوں نے اپنے کلام میں قاصد کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ ان اشعاروں میں وہ قاصد کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ محبوب مجھ سے اداس یا ناراض نہ ہو۔

ان غزلوں سے نظام کی سوانح عمری کا بھی پتہ چلتا ہے بے وقت مختلف طوائفوں سے ربط وضبط نے نظام کی شاعری سے متعلق رائے عام کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس قسم کے بہت اشعار ہیں ان کی کلیات میں جن میں ہوس پرستی ومعاملہ بندی کے بجائے عشق ایک روحانی اور باطنی تجربہ میں ڈھل گیا ہو۔ وصل کی مدت کے بعد قاری پر ایک عجب سی

کیفیت طاری کر دیتا ہے۔

غم سے کس دن میں بے قرار نہیں
بے قراری میں بھی قرار نہیں
کس گھڑی تیرا انتظار نہیں
کون سے دم میں بے قرار نہیں
موت آجائے ہجر میں شاید
اس کے آنے کا اعتبار نہیں
گر ہوا انکار وصل تو کیا ہوا
ہمیں اقرار پے قرار نہیں
رگڑے جھگڑے میں ہی کٹی سب عمر
تیغ قاتل بھی آبدار نہیں
اتنا روٹھو نہ میرے شکووں سے
ابھی میں آزمودہ کار نہیں
ہاں ہزاروں خیال ہیں دل میں
واں ذرا عزت وقار نہیں
ان کو طرز وفا سیکھاتا ہوں
کوئی چمن سا دوستدار نہیں
ایسی باتوں کو مانتا ہے کون
ہاں نہیں ایک بھی ہزار نہیں
رات تھا وصل آج ہجر کا دن
کچھ زمانے کا اعتبار نہیں

دل ربائی کا ان کو شوق ہے
ہائے ہاں دل بھی تین چار نہیں
شب فرقت تو تیر ہے یارب
موت ہے ہم کو انتظار نہیں
باتوں باتوں میں رات جاتی ہے
آج کیوں صبح اشکبار نہیں
جان سے جس لیے گزرتا ہوں
وہاں کسی طور سے قرار نہیں

اس غزل میں نظاؔم نے عاشق کے شکوے شکایت کو درج کیا ہے۔اوراس کے غم اور بے قراری کے تصادم اور کشمکش کو اس پیمانے میں ڈھالا ہے عاشق اتنا بے قرار ہے کہ معشوق کے ہجر میں موت کا تو اسے اعتبار آ جاتا ہے لیکن معشوق کا عاشق سے ملنے کی آس نہیں ہوتی اس میں معشوق کی بے وفائی کا بیان ہے۔اور عاشق و معشوق کے اندر جو عشق کے درجات ہوتے ہیں۔وہ ایک طرفہ دکھائی دیتے ہیں، پھر عاشق کی زبان سے معشوق کا روٹھ جانا عاشق کی عزت نہ کرنا معشوق کا غیروں کی طرف متوجہ ہونا یہ سب اردو کی قدیم غزلوں کی طرح اس میں بھی موجود ہے۔لیکن شکوے شکایت کے بعد عشق کے جو درجات ہوتے ہیں۔اس کو بھی اس غزل میں بیان کیا گیا ہے معشوق کی ہمیشہ بے توجہی کے بعد بھی عاشی کے حصے میں وصل آتا ہے۔لیکن پھر ہجر کا شکار ہو جاتا ہے۔جس کی بنا پر اس غزل کے کچھ اشعار میں شب فرقت کو قہر موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔عاشق و معشوق سے ملنے کی خوشگوار گھڑی کا بھی ذکر کرتا ہے۔اور بچھڑنے کا بھی پھر خفگی اور ناراضگی کا بھی، پوری غزل میں جو عشقیہ تصادم ہوتے ہیں، وہ موجود ہیں، عاشق کا معشوق سے ناراضگی بھی اس طرح سے ہے، کچھ لمحوں کے لئے اس سے ناراض ہوتا ہے۔پھر اپنے آپ کو نہیں روک پاتا، اور معشوق کا گن گانے لگتا ہے۔نظاؔم رامپوری کی غزلوں کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو ان کی غزلوں میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کے کشمکش موجود ہے۔اس غزل میں ان کے کچھ اشعار عشق حقیقی سے وحدت الوجود کی طرف لے جاتے ہیں۔لیکن کچھ غزلوں میں تو وہی پرانی عاشق مزاجی موجود ہے۔ایک طرف تو ان کی غزلیں ولی کے عشق حقیقی کی یاد دلاتی

ہیں۔تو دوسری طرف حسرت موہانی کی کھلے عشق مجازی کی جس میں تمثیلی معشوق ہےان کے نازنکھرے ہیں۔ بہرکیف نظام کی غزلیں اس طرح سے کی ہیں جس میں کلاسکیت موجود ہے

مریض عشق کو مرنا شفا سے کیا کم ہے
مجھے تو زہر بھی کھانا دوا سے کیا کم ہے
ملا کے آنکھ ذرا ہنس کے پھیرنا یوں منہ
یہ بے حجابی تمہاری حیا سے کم ہے
کبھی تم سے مجھے بھی خدا ملائے گا
ہر گھڑی میرا رونا دعا سے کیا کم ہے
جفا وہ جو کرے بے حیا کے پردے میں
وہ آشنا بھی تو نا آشنا سے کم ہے
لبوں پے جان تو آپہنچی آگے کیا ہوگا
شب فراق بھی روز قضا سے کیا کم ہے
ملنے سے اور بھی ہوتی ہے دل کو بے چینی
تمارا پیار بھی جو رو جفا سے کیا کم ہے
ہر ایک بات یہ دل کو لیئیے سہے لیتا ہوں
جو بات ہے تیری ان وعدے سے کیا کم ہے
قدم کے رکھتے ہی بس درد دل ہوا موقوف
گلی بھی یار کی درالشفا سے کیا کم ہے
بنی ہے جان پہ لب پر خدا خدا ہے
نبیوں کی یاد بھی یاد خدا سے کیا کم ہے

نظآم رامپوری کی یہ غزل اردو ادب کی ان غزلوں میں سے ایک ہے جس میں عشق کی حرارت اس قدر بڑھ چکی ہے اس کا علاج صرف مرنا ہے۔اور مرنے کے بعد عاشق بے چینی سے درد ہو جاتا ہے۔نظام کی اکثر غزلیں غموں کی غماز ہیں وہ جس زمانے میں شاعری کرر ہے تھے۔اس وقت شاعر اپنے اندر کے جذبات واحساسات کو صفحہ قرطاس پر لاتے تھے۔اور جو غزلوں کے شروعاتی دور میں عناصر موجود تھے۔وہ یہ کہ تصوراتی محبوب کا بیان معشوق کے ناز و نخرے یا پھر عشق حقیقی عشق مجازی تھا تصوف کی سیڑھی پر چڑھ کر خدا سے ملتا تھا، تو کہیں مزاج معشوق اصل کے زلف و رخسار اس کے تمام اوصاف کو بیان کرتا تھا، اس غزل میں بھی کچھ ایسی چیزیں موجود ہیں، جو بغور مطالعہ کرنے کے بعد پوری غزل عشق مجازی، عشق میں اس طرح گرفتار ہے، اور بے چہرگی کا شکار ہے۔عشق کا مریض ہوں حالت میں قرار نہیں ہوتا ہے۔مریض عشق کو سے زہر سے تعبیر کیا ہے زہر تھوڑا مہمل لفظ ہے ویسے زہر بنیادی محاورے میں مشتعمل ہے ، بہرحال شاعر کی اپنی سوچ خیال ہوتی ہے اور اشعار کی ضرورت بھی ہوتی ہے جس کو ہم ضرورت شیریں کہتے ہیں ۔اس غزل میں بھی شاعر معشوق کی طرف آس لگائے ہوئے، اپنی امید کو برقرار رکھتا ہے اور یہ دل میں تمنا کر بیٹھتا ہے، کوئی تو وقت آئے گا، کہ میرا خدا معشوق سے مجھے ملا دے گا۔اور میرا رونا دعا کرنا کام کر جائے گا پوری غزل میں امیدیں اور نا امیدی کی کشمکش اور تصادم موجود ہے، مقطع کا شعر کچھ الگ ہے اچھے پیرائے میں پیش گیا ہے۔جس میں شاعر معشوق کی صفت کو بت سے تعبیر کرتا ہے۔اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بتوں میں کوئی حرکت و جذبات نہیں ہوتے، اسی طرح ہمارے معشوق میں بھی ہمارے لئے خاموشی ہے، اور بغیر حرکت کے ہیں لیکن پھر بھی ہم عاشق ہیں اس کی یاد میں گرویدہ ہے اور اسے خدا کی یاد سے تعبیر کیا ہے۔نظآم رام پوری کی شاعری میں اگر فلسفہ کی بات کی جائے تو کوئی زندگی کا فلسفہ نہیں ملتا ہے، اور تاہم ان کی غزلوں میں زندگی جینے کا فلسفہ ضرور مل جاتا ہے۔کہ انسان کو کسی بھی مصیبت سے گھبرانا نہیں چاہئے اس امید کو برقرار رکھنا چاہیے اور یہ فلسفہ ان کے عشقیہ بیان سے ان کی غزلوں میں اجاگر ہوتا ہے

انگڑائی بھی وہ لے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ
بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں

کیا منھ پہ اس نے رکھ لیئے آنکھیں چرا کے ہاتھ
یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائیں غیر
اور اس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ
بے اختیار ہو کے جو پاؤ پر گرا
ٹھوڑی کے نیچے اس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ
وہ زانوؤں میں سینا چھپانا سمٹ کے ہائے
اور پھر سنبھالنا وہ دوپٹہ چھڑا کے ہاتھ
قاصد تیرے بیان سے دل ایسا ٹھہر گیا
گویا کسی نے رکھ دیا سینے پہ آ کے ہاتھ
کوچے سے تیرے اُٹھے تو پھر جائیں ہم کہاں
بیٹھے ہیں یاتو دونوں جہاں سے اٹھا کے ہاتھ
پہنچانا پھر تو کیا ہی ندامت ہوئی انھیں
پنڈت سمجھ کے مجھ کو اپنا دکھا کے ہاتھ
دنیا وہ اسکا ساغر مے یار ہے نظام
منھ پھر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

اس غزل کا جو پہلا شعر ہے یہ ضرب المثل ہے۔ یہ نظاؔم رامپوری کا سب سے مشہور شعر ہے اس شعر کی وجہ سے نظام کو اتنی شہرت ملی۔ مگر شاد عارفؔی اس شعر کے متعلق ایک عجیب وغریب کہانی کا ذکر کرتے ہیں۔

شاد عارفؔی کا قول ہے کہ:

''انگڑائی بھی وہ لے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

اگر آپ حیران نہ ہو اور میری پندرہ سالہ تحقیق وتلاش پر بھروسہ کرلیں

تو میں آپ کو یہ اطلاع فراہم کرسکتا ہوں کہ اُپر دیئے ہوئے حضرت نظاؔم کے مطالع میں پہلا مصرا حضرت رامپوری کا نہیں بلکہ نواب کلب علی خان صاحب التخلص بہ نواب کی فکر کا نتیجہ ہے جسے مرحوم نے محل سرائے کے کسی منظر سے متاثر ہوکر نظم کیا اور باہر آ کر شعرائے دربار سے اس پر گرہ کی فرمائش کی اپنے اپنے رنگ میں سبھی نے زور مارا مگر مصرعہ کا واقعاتی رخ کسی کی گرہ برداشت نہ کر سکا جونکہ یہ مصرعہ حضرت نظاؔم کے ڈھب کا تھا چناچہ انھوں نے کہا۔۔۔دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ مصرعہ دست و گریباں ہوگیا تھا اس لیے نواب صاحب نے اظہار خوشنودی کے طور پر اپنا مصرعہ یہ کہہ کر نظام رامپوری کو عطا کر دیا کہ یہ مصرعہ تم ہی لے لو اور حضرت نظام نے بھی کمی نہیں کی کیوں کہ وہ کوئی جا گیر نہیں تھی جسے اوڑھا یا بچھایا جاسکتا۔۔۔اور پھر اس مطلع پر پوری غزل کہی جو حضرت نظاؔم صاحب کا دیوان کا حاصل ہے۔''3؎

اس غزل نے نظام رامپوری کو اردو شاعری میں مقام دیا ہے۔اکثر شاعروں کے کلام میں ایک دو غزل بہت اچھی ہوتی ہیں۔اور ان غزلوں میں بیشتر اچھے شعر ہوتے ہیں،خصوصیت کے ساتھ اس غزل کے پہلا شعر کا بھی یہی حال ہے۔ پہلا شعر بہت مشہور ہے اور یہ رامپور کے لوگوں کی زبان پر رٹا ہوا تھا کسی زمانے میں اسی شعر سے لوگ نظاؔم راپوری کو جانتے تھے۔اس طریقے کی پانچ سے دس غزلیں تو ایسی ہیں۔جس نے نظام رامپوری کو اردو شاعری میں زندہ جاوید کیا ہے۔

ان کی شاعری میں معاملہ بندی کا ذکر اس سے قبل بھی ہو چکا ہے تاہم یہاں تھوڑی مزید صراحت کر دی جا رہی ہے تا کہ بات واضح ہوجائے معاملہ بندی سے مراد راز و نیاز کی باتیں ہیں۔ جسے ہر شخص چھپانے کی باتیں کرتا ہے وہ باتیں ہیں جو خلوت میں عاشق معشوق طالب ومطلوب کے درمیان ہوتی ہیں۔ پیار محبت کی جذباتی گفتگو بھی ہوسکتی ہے انسانی ہوس بھی ہوسکتی اور یہ کہ لکھنوی شاعری کا ایک نمایا وصف رہا ہے۔یہی شئی جب حد سے تجاوز کر جائے اور نفس اجزا کے طلب کھول کر اشارہ کرے تو معاملہ بندی اردو شاعری میں ایک داغ کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور اس

میں نفسیاتی کیفیت ہوس پرستی آآتی ہے، جس میں وحشیانہ پن ہو۔اس طرح کہ بہت سے اشعار نظام کی شاعری میں بھی موجود ہیں۔جس میں وحشیانہ پن نظر آتا ہے۔فراق گورکھپوری اس شعر میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں شعر ملاحظہ فرمایئے

فراق گورکھپوری نظام کے اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں

انگڑائی بھی وہ لے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

معاملہ بندی اور ادا بندی کی شاعری اچھی ہوتی ہے۔لیکن آفاقی وسعتیں اس میں نہیں ہوتی ہیں دنیا کے بڑے عشقیہ شاعروں کے یہاں معاملہ بندی اور ادا بندی کے اشعار ان کے کلام کے اہم ترین اجزا نہیں ہیں۔اب سے تیس برس پہلے کی بات ہے ابھی میں سن شعور کو پہنچا ہی تھا نہایت ہی شدومت کے ساتھ لوگوں نے نظام رامپوری کا مجھے یہ شعر سنایا۔

انگڑائی بھی وہ لے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

اور انور دہلوی کا یہ شعر بھی جو مندرجہ بالا شعر سے کچھ کم مشہور نہیں:

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پوچھیئے اپنی جبیں سے

اور ایک مدت تک میں بھی ان اشعار کی تعریف کرتا رہا لیکن میرے دل میں ان اشعار سے متعلق ایک دبا چور تھا میرے وجدان اشعار سے جہاں ایک طرف متفق تھے۔وہاں دوسری طرف کچھ مجروح بھی ہوتا تھا۔لیکن اس ناسودگی کا سبب ذرا بعد میں سمجھ میں آیا کہ دونوں اشعاروں میں ان کے تمام محاسن کے باوجود کچھ کمی بھی تھی اور وہ یہ کہ معشوق اور معشوق کی حالت سے ہمدردی اور ہم آہنگی کا جز یا احساس ان اشعار میں نہیں ہے۔یعنی نظامؔ رامپوری کے اشعار میں نا مشعوق سے مغائرت یا غیرت کا اظہار ہے یہ طرز بیان اہل لکھنؤ کی چیز ہے اور میری نظر میں پسندیدہ نہیں۔

گئے ہیں جب سے اٹھ کر پاس سے ہے حال باہر مرا بیان سے

کہیئے کوئی اتنا جان جان سے ملو نہیں تو گیا میں جان سے
جو کچھ گزرتا ہے میرے دل پر سناوں کس کو وہ ہائے دل بر
خدا کرے پھر وہ دن پھر کہوں میں اپنی ہی زبان سے
کبھی خفا ہوکے بات کرنا کبھی وہ کہہ کہہ کے پھر مکرنا
پھر الٹا بہتان مجھ پہ دھرنا یہ طرز تم نے لیا کہاں سے
کبھی تیرے غم میں مجھ کو رونا کبھی پھر آپ ہی ہے چپ کے رونا
جو یاد آتا ہے ساتھ سونا تو رات کٹتی ہے کس فغان سے
گھڑی گھڑی ہجر کی ہے بھاری دکھائے صورت خدا تمہاری
سنو وہ باتیں پیاری پیاری عجب ادا سے عجب بیان سے
تیرا خفا ہوکے روٹھ جانا وہ منتوں سے میرا منانا
وہ اپنی اپنی سی کچھ سنانا وہ باتیں بھی اب داستان سے
عجب ہے دشمن سے دوستی کی کہ شکل اب یہ زندگی کی
لبوں پہ ہچکی ہے جان کئی کے پڑے ہیں بیہوش نیم جان سے
کہا کچھ اس نے یہاں کسی سے یہ بات قاصد نہیں کی ہے
گمان ہوتا ہے اور ہی سے تیرے الجھتے ہوئے بیان سے
نظام کیوں تو نے اس کو چاہا یہ دل میں کیا تھی جو دل لگایا
جو دیوے توفیق کچھ بھی مولا تو اب نہ ملنا کسی بتان سے

اس میں نظاؔم رامپوری نے اپنے دل کی کیفیت کو ایک الگ انداز میں بیان کیا ہے کہ جب سے وہ میرے پاس سے گئے ہیں تب سے میرے دل میں اضطرابی محبوب کے اچانک دور ہونے کی دل کی دھڑکنیں تیز ہوئی ہیں اور محبوب چلا گیا اب دکھاؤں کس کو اور کس سے بیان کروں اور اللہ سے دعا کرتا ہے اور کہتا ہے، پھر وہ آجائے تو اپنی زبان سے اپنے دل کی کیفیت کو اس سے ذکر کروں گا مگر کیا کروں آگے کہتا ہے اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ الٹی

شکایت مجھ سے ہی کر دیتا ہے، اب وہ اپنے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر کے محبوب کی یاد کو پھر سے اُجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

نظآم رامپوری نے اپنی شاعری میں غم عشق اور غم زندگی کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نظآم رامپورؔی کے کلام کا مطالعہ کرنے سے قاری کے جذبات واحساسات میں ضبط کے ساتھ عمل کو پیدا کر دیتے ہیں۔

کیوں کہتے ہو کہ میری وہ عادت نہیں رہی
سچ ہے مجھی کو آپ کی الفت نہیں رہی
تسکین کو میری کہتے ہیں دشمن کو کہہ کے کچھ
لو اب تو تم کو جائے شکایت نہیں رہی
ائے دوستو مجھے تو نہ پھر لے چلو وہاں
محفل میں ان کی میری وہ عزت نہیں رہی
دشمن تو تھے ہی وہ بھی خفا ہم سے ہوگئے
اب ان سے ملنے کی کوئی صورت نہیں رہی
کہتے ہیں وہ کہ آپکو پھر کیوں ہے رشک غیر
گر کہئے اب زمانے میں الفت نہیں رہی
جی چاہے آپ کا ملو جی چاہے رک رہو
ہم کو بھی پہلے سے محبت نہیں رہی
کچھ اپنا حال کہنے سے صاحب سے فائدہ
کسی دن مجھکو الٹے ندامت نہیں رہی
میں جانتا ہوں آپ کے ایسے پاک کو
کہہ دو نہ صاف دل میں محبت نہیں رہی
اب کیا ملیں کسی سے کہاں جائیں نظآم

ہم وہ نہیں رہے وہ محبت نہیں رہی

نظآم رامپوری کی شاعری کا موضوع وسیع ہے مگر ان کی شاعری کا موضوع مرکزی ،اساسی عشق و محبت ہے۔ان کے یہاں عشق میں ناکامی نامرادی اور مایوسی واداسی کے ساتھ ساتھ عشق نشاط انگیزی ومسرت کا بھی کہیں نہ کہیں ذکر ہے وہ عشق کے ساتھ زندگی کوخوشگوار کرنے کی کوشش میں مسلسل لگے ہوئے ہیں۔

نظآم رامپوری کی شاعری میں حسن وعشق داخلی کیفیت کے حاصل ہیں۔ان کے شاعری میں حسن اور عشق کا رشتہ آپس میں بہت مضبوط ہے۔اصل میں نظآم رامپوری نے زندگی کو جس طریقے سے بسر کیا اسی طریقے سے اپنی شاعری میں بیان کر دیا۔

کیا کہیں غم میں تیرے کس قدر رویا کیئے
سچ تو یوں ہے آہیں بھر بھر عمر بھر رویا کیئے
خوب تم وعدے پہ آئے خوب تڑپایا ہمیں
تم رہے خوش گھر میں ہم گھر رویا کیئے
اُف رے صدمہ درد فرقت کا پھٹا جاتا ہے دل
ضبط بھی ہم نے کیا ہر چند پر رویا کیئے
وصل میں بھی اپنی آنکھوں سے تھا آنسو نہیں
حال دل کہہ کہہ کے اس سے رات بھر رویا کیئے
کوچہ جانا جب جانے نہ پائے ہم
دور ہی سے دیکھ وہ دیواروں در رویا کیئے
ایک دن بھی آپ نے آکر ہمیں دیکھا نہیں
منہ لپیٹے اپنا ہم دو دوپہر رویا کیئے
شام سے تا صبح یوں ہی صبح سے پھرتا شام
ہم تو دوری میں تیری آٹھوں ہر پہر رویا کیئے

وائے بے رحمی تری کچھ بات تک پوچھی نہیں
پھروں ہم رکے ہوئے قدموں پر سر رویا کیئے
ہائے رونے پر مرے کہنا کسی کا ائے نظآم
میرا کیا کچھ کر لیا صاحب اگر رویا کیئے

نظآم رامپوری کی اصل زندگی بہت دُکھ درد و مصیبت میں گزری مگر ان کی شاعری میں زندگی سے محبت اور محبوب کی نافرمانی دکھائی دیتی ہے۔نظآم نے بہت تنگ دستی کی حالت میں زندگی بسر کی لیکن اس کے باوجود بھی قانع تھے درباروں سے وابسطہ ہونے کے باوجود بے نیاز تھے ان کی شاعری میں محبوب کے ہجر وصال اصل میں غزل کے معنی عورتوں کے ساتھ گفتگو اور عشق کے ہیں۔نظآم کی غزل اسی مزاج کی حامل ہے۔جس میں انھوں نے عورتوں کے تعلق سے عاشقانہ جذبات ومحبت ومعاملات کا مزے کے ساتھ اظہار کیا ہے۔جس زمانے میں انھوں نے شعور کی آنکھ کھولی تو اس وقت رامپور میں شعروشاعری کا ایک ماحول تھا یہ گھر میں شاعر تھے اور شعروشاعری کا چرچہ عام تھا۔

نظام رامپوری کی شاعری میں معاملہ بندی ہے معاملہ بندی کے تعلق سے محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

''معاملہ بندی اس سماج میں چلتی ہے جہاں مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے بالکل الگ رہتے ہوں۔ایسے حالات میں لوگوں کو گندی جائیں سنانے کا شوق بڑھ جاتا ہے اور چمن سے ایک چھلک دیکھ لینا پایا آنچل نظر آجانا بھی گندی بات بن جاتی ہے یہاں ذراسی تفصیل بھی پرات خود لطف دینے لگی ہے اور لوگ فوراً کبھی کبھی ہنس دیتے ہیں،اس لئے سراپا کے بیان میں اس قسم کی دلچسپی پیدا ہوتی ہے جو اکثر لکھنوی شاعروں کے یہاں ملتی یعنی سراپا کا مقصد جسم کی تفصیلات گنوانا ہو جاتا ہے جرئت جیسے شاعروں کی بدولت اردو شاعری میں حقیقت نگاری کا وہ قابل قدر تو ضروری ہے لیکن دلچسپ واقعات یا مزید قصہ سنانے کے معشوق میں جرات ومعاملہ بندی والے شاعروں کو بعض دفعہ پر بھی خیال نہیں رہتا کہ

قصہ تو ہو گیا مگر شاعری ہوئی کے نہیں۔''4

کسی نے پکڑا دامن اور کسی نے آستیں پکڑی
نہ اٹھا میں ہی اس کوچہ سے یہ زمیں نے زمیں پکڑی
خدا شاہد دل پر ایک چوٹ سے لگ گئی میرے
بہانہ درد سر کا کر کے جب اس نے جبیں پکڑی
سوا ان کے نہ کہنا اور سے آفت نہ کچھ آئے
نہ جائے بات میری قاصد شاہد کہیں پکڑی
بھلا اب مجھ سے چھٹا ہے کہیں اس شوخ کا چمکا
یہ کیا چھیڑ میری ہر گھڑی کی ہم نشیں پکڑی
غضب میں آپ بھی میں نے تو تم سے کان پکڑا ہے
ہوا جب کچھ میں کہنے کو زبان میری وہی پکڑی
یہ قسمت وصل کی شب صبح تک تکرار میں گزری
ادھر کچھ میں نے ضد پکڑی ادھر اس نے نہیں پکڑی
مجھے ڈسواؤ اک مارسیہ سے یہ سزا دیجئے
جفاں اپنے صاحب کی جرزلف عنبرین پکڑی
خدا کے فضل سے ایسی طبیعت ہے نظامؔ اپنی

متذکرہ غزل میں نظامؔ رامپوری نے زندگی کے اس پیچ وخم کو پیش کیا ہے۔جس میں انسان الگ الگ طریقے سے مصیبت میں بھرا ہوا ہوتا ہے۔اور کوئی بھی اقرباء میں سے اس کے کام نہیں آتا، ہر کوئی انسان کی ٹانگ کھینچتا ہے۔جس وجہ سے انسان اندر سے ٹوٹا ہوا بے چین سا ہوتا ہے۔اس چیز کو شاعر نے اپنی عشقیہ غزل میں اس طرح سے ذکر کیا ہے۔کہ کسی نے پکڑا دامن کسی نے آستین پکڑی یعنی چاروں طرف سے اسے افراد خانہ اور غیر افراد خانہ سے مصیبت ہی ہے۔پر غزل میں عشقیہ لب ولہجہ برقرار ہے،جس میں یہ کہہ رہا ہے ہمیں معشوق کے کوچے سے غم میں مبتلا

ہوکر اٹھا، مجھے اس کے کوچے سے الگ جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔معشوق عاشق سے کوئی بہانہ بنا کے دور جاتی ہے، جب عاشق کو پتہ چلا کہ دردسر کا بہانا بنایا گیا تو عاشق کا دل ہی ٹوٹ جاتا ہے۔لیکن پھر بھی ان تمام دکھوں کا عاشق سامنا کرتا ہے۔اور اپنی چاہت سے دور نہیں جاتا،ان کی غزلوں میں جو یہ عشق کی شدت ہے، کہیں نہ کہیں شاعری کی علامت میں اس بات کی طرف لے جاتی ہے انسان کے اوپر زمانے کے لوگوں کی طرف سے کتنا بھی ظلم کیا جائے،اور یا پھر اس سے درکنار کیا جائے انسان کو اپنی زندگی جینے کا حوصلہ برقرار رکھنا چاہیے تمام دکھ وظلم کا مقابلہ کرنا چاہیے،اس امید سے دامن چھوڑنا نہیں چاہیے، یہ جینے کا فلسفہ اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ان کی شاعری میں عشقیہ تکرار موجود ہے۔اس طرح سے اس غزل میں بھی نظاؔم رامپوری نے شاعری کی فنی لوازمات کو برتتے ہوئے عشقیہ شاعری کے واسطے متذکرہ چیزوں کو پیش کیا ہے۔

نہیں سوجھتا کوئی چارا مجھے
تمہاری جدائی نے مارا مجھے
ادھر آ کے لڑتے ہیں اغیار سے
ادھر کرتے جانا اشارا مجھے
تو اک بار سن لے میرا حال کچھ
نا کچھ کہنے دینا دوبارا مجھے
یونہی روز آنے کو کہتے ہو تم
نہیں اعتبار اب تمہارا مجھے
کسی سے مجھے کچھ شکایت نہیں
نظاؔم اپنے ہی دل نے مارا مجھے

(غزل،۲٦٦،ص،۱۹۲)

کہئے گر ربط مدعی سے ہے
کہتے ہیں دوستی تجھی سے ہے

دیکھئے آگے آگے کیا کچھ ہو
دل کی حالت یہ کچھ ابھی سی ہے
اس کی الفت میں جیتے جی مرنا
فائدہ یہ بھی زندگی سے ہے
ضد ہی گر ہے تو ہو سبھی کے ساتھ
یا منہ ملنے کی ضد مجھی سے ہے
صرف سے تم سے کہہ نہیں سکتے
دل میں ایک آرزو کبھی سے ہے
مجھ سے پوچھو ہو کس سے الفت ہے
تم سمجھتے نہیں کسی سے ہے
اس قدر آپ ہم پہ ظلم کریں
اس کا انصاف آپ ہی سے ہے
اشک دشمن نہ ہو سکے گا نظآم
یہ بھی ناچار اپنے جی سے ہے

نظام رامپوریؔ کی شاعری میں زندگی کی حقیقتیں،لوگوں کی فریبیاں،نفسیات کی باریکیاں اور مافی انقلاب ملتا ہے اور شاعری میں منظر نگاری کے نمونے بہت سے ملتے ہیں۔ابتدا میں یہ نمونے مثنوی وغیرہ میں بھی ہوتے تھے۔یہ ایک طریقے کی مصوری یا پیٹنگ ہے خیال کی تصویریں جو ذہن کی قرار ہیں نقشہ کھینچ دیں لفظوں کی بناوٹ پھر انھیں سانچہ میں ڈھالنے کے ساتھ ساتھ اپنی بات کہنے کے لئے انکا استعمال کرنا وہ بھی شاعری کے اندر یا نظآم کے اندر صفت موجود ہے۔وہ زندگی معاشرت اور عہد کے مظاہرے دور زندگی کے واقعات کو اپنی شاعری میں کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ایک منظر کشی ہوجاتی ہے۔شاعری کو بڑھتے ہوئے نگاروں کے سامنے ایک تصویر پر گھومنے لگتی ہے۔

تمیں ہاں کسی سے محبت کہاں ہے
ذرا دیکھئے تو وہ صورت کہاں ہے
بھلا اب کسی سے بات کیا تم
تمہیں اپنی باتوں سے فرصت کہاں ہے
ہر ایک بات پر روئے دیتے ہو اب
وہ شوخی کہاں وہ شرارت کہاں ہے
پڑے رہتے ہو پھر بھی منہ لپیٹے
وہ جلسہ کہاں ہے وہ صحبت کہاں ہے
کوئی کچھ کہے اب تمہیں کچھ نہ بولوں
وہ تیزی کہاں ہے وہ ظرافت کہاں ہے
وہ الگ چلنا ہر ایک سے آفت تمہارا
وہ تندی وہ شوخی وہ فرحت کہاں ہے
کوئی جانتا بھی نہیں اب تم کو
وہ پہلی سے خوابوں میں شہرت کہاں ہے
تمیں ہو عدو کا ملنا مبارک
عدو کی سی ہم میں لیاقت کہاں ہے
نظاؔم آپ ہی آپ آئے گا یہاں پر
یہاں رشک سہنے کی طاقت کہاں ہے۔

(غزل،۲،۲۷،ص۱۹۶)

نظاؔم رامپوری کی اس غزل کو اگر گہرائی سے پڑھیں گے تو یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ ان کی عشقیہ غزل میں کچھ اپنے زمانے کچھ افراد زمانے سے شکایت کی گئی ہے۔ وہ معشوق کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ کیئے

ہیں آج ہمارے زمانے میں جس قسم کی محبت ہے،اس میں کہیں نہ کہیں کمی آ چکی ہے۔لیکن یہ بات بتانے کی ہے جب ہم ولی سے لے کر شجاع خاور تک کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب کی شاعری میں اپنے زمانے سے شکایت اور پچھلے وقت کی خوش گواری کو یاد کیا جاتا ہے۔لیکن میرے مطالعے کے مطابق اس میں شاعروں کی کچھ شکایت تو رسمی رہی ہے اور کچھ حقیقی بھی ہوسکتا ہے۔داغؔ دہلوی اور نظامؔ رامپوریؔ کا زمانہ ایک ہی ہے اس زمانے کے اکثر شاعروں نے اپنی ماضی کو یاد کیا ہے دور حاضر کے شعرا ندا فاضلیؔ ،انبر بہرائچیؔ وغیرہ نے اپنے سے پہلے زمانے کی خوشگوار کیفیت کو یاد کر کے زمانے حال کی جزا وفزا کرتے ہیں کل ملا کر نتیجہ یہ نکلتا ہے۔کہیں نہ کہیں اس میں انسانی فطرت کا اثر زیادہ ہے انسان اپنی قدر اور اپنے گردو پیش کی قدر کم کرتا ہے اور اس دور کی چیزیں زیادہ اچھی لگتے ہیں، بہرحال یہ سماجی مسئلہ ہے جس پر بحث ہوسکتی ہے۔

تمیں ہاں کسی سے محبت کہاں ہے
ذرا دیکھئے تو وہ صورت کہاں ہے
بھلا اب کسی سے بات کیا تم
تمہیں اپنی باتوں سے فرصت کہاں ہے
ہر ایک بات پر روئے دیتے ہو اب
وہ شوخی کہاں وہ شرارت کہاں ہے
پڑے رہتے ہو پھر بھی منہ لپیٹے
وہ جلسہ کہاں ہے وہ صحبت کہاں ہے
کوئی کچھ کہے اب تمہیں کچھ نہ بولوں
وہ تیزی کہاں ہے وہ ظرافت کہاں ہے
وہ الگ چلنا ہر ایک سے آفت تمہارا
وہ تندی وہ شوخی وہ فرحت کہاں ہے
کوئی جانتا بھی نہیں اب تم کو

وہ پہلی سے خوابوں میں شہرت کہاں ہے
تمہیں ہو عدو کا ملنا مبارک
عدو کی سی ہم میں لیاقت کہاں ہے
نظاؔم آپ ہی آپ آئے گا یہاں پر
یہاں رشک سہنے کی طاقت کہاں ہے

اس غزل میں نظاؔم رامپوری کہ رہے ہیں معشوق کو اب مجھ سے محبت نہیں میرا محبوب پہلے جیسی نہیں رہا معشوق کسی طرح کی بات بھی نہیں سنتا،اس کے رہن سہن میں بھی بہت تبدیلی ہوگئی ہے معشوق اب ہر بات پر رونے لگتی ہے۔اس میں وہ تیزی وشوخی نہیں ہے جس کی وجہ سے معشوق بہت خوبصورت ہوتی تھی اب وہ محفلیں بھی منعقد نہیں ہوتی ہیں،جس میں خوشی کا ماحول ہوا کرتا تھا اب معشوق پوری بدل چکی ہے،ساتھ ساتھ اس کے اخلاق میں بھی بدلاؤ آ گیا ہے حقیقت میں اب وہ ہرجائی ہوگئی ہے۔تب شاعر کہتا ہے تمہیں دشمن سے ملنا مبارک ہو حالانکہ یہ بات محلّٰہ نظر ہے عاشق ابتدا کی شاعری میں عاشق معشوق کو عدو سے ملنے کی مبارکباد دیتا ہے اور وہی چیز نظاؔم رامپوری کی اس غزل میں بھی موجود ہے ان کی اس غزل میں عشقیہ بیان اور زندگی کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے۔

ضائع نہیں ہوئی تدبیر کسی کی
میری سی خدایا نہ ہو تقدیر کسی کی
نا حق میں بگڑ جانے کی عادت یہ غضب ہے
ثابت تو کیا کیجیے تقصیر کسی کی
قاصد یہ زبانی تیری باتیں تو سنی ہیں
تب جانو کہ راوئے تم دم کسی کی
بے ساختہ پھروں میں کہاں کرتے ہیں کیا کیا
ہم ہوئے ہیں اور ہوتی ہے تصویر کسی کی
ایسی تو نظاؔم ان کی نہ عادت تھی وفا کی
وہ جانے نہ جانے یہ بے تاثیر کسی کی

نظام شاعری میں یک رنگی ادا بندی اور معاملات عشق سے باہر نہیں نکل پاتے، اس وجہ سے ان کی شاعری کا دائرہ محدود ہو گیا ہے۔جس طریقے سے غزل کی عام روایت رہی۔مگر انھوں نے اپنی شاعری میں ادائیں اور عشق کی آرزو مندی اوران کی جہتوں کو الگ الگ انداز میں استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اس طریقے سے نظآم رامپوری شاعری پر قابض ہو گئے۔اسی انداز میں معاملات اور کیفیت کو بیان کیا، ایک طریقے کی مصوری کا حق ادا ہو گیا۔ یہ محسوس ہوا کہ یہ اصل زندگی میں پہلے ہوتے ہوئے ہیں نظآم رامپوری کے بہت سے شعر اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ انھوں نے جو اپنی شاعری میں ذکر کیا ہے۔وہ بیتی ہوئی باتیں ہیں، جو بغیر ہچکچاہٹ اور تکلف کے بغیر بیان میں آگئی ہیں اور تنہائی میں یاد آنے والی باتیں ہیں۔ان لمحوں کا عکس جو دماغ میں چھا گیا ہے، سب اس کی تفسیر ہے جو زبان سے شعری شکل باہر آتی ہے۔نظام نے جو یہ شاعری کا رنگ ڈھنگ اپنایا ہے اس میں دل کشی اور واقعہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ زندگی میں جو عشق کے واقعات جو پیش آئے اسے بڑی شوخی کے ساتھ اپنے الفاظوں میں ترجمانی کی ہے۔اصل بات اس شاعری میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے بیچ ہونے میں واقعہ پیش آنے میں زندگی کی کہانی بتانے میں ذرا سا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے شک نہیں پیدا ہوتا ہے۔نظآم نے کچھ اس طریقے کا انداز اپنایا ہے۔اس شاعری کے ذریعے ان کو جسمانی تجربوں خواہشوں کی۔

جسمانی اعضا و جنسی معاملات اس میں محفوظ کر لئے تصویریں اُجاگر کر دی گئی ہیں صرف شاعری کے ذریعے اب سچ بھی کہے کوئی تو مجھ کو نہ یقیں ہو

ہااس میں پہلا اور آخری شعر داد طلب ہے۔نظآم کا ہی طرز وسخن اور انداز کلام و بیان ہے جس نے انھیں اردو شاعری میں اہمیت بخشی ہے۔

خود کلام یعنی اپنے دل سے باتیں کرنا یہ باتیں خاص کر محبوب کی ہی ہوتی ہیں اس کی اداوں کی وعدہ خلافی کی التجا، کی اور ایسی ہی بہت سی باتیں جن کو تہ شمار کیا جا سکتا ہے اور جن کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔

تو بھی اس شوخ سے واقف ہے بتا نظآم
کچھ آپ کو خبر بھی ہے سید نظآم کی
مجھ سے دل مانگے تو انکار کروں یا نہ کروں

بے چارہ تنگ آکے وطن سے نکل گیا
اب حال نظاؔم کچھ نہ پوچھو
اب ہمارا حال نہ پوچھو نظاؔم
غم ہوگا تمہیں بھی گر کہوں گا
کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا
کیا نظام اس بت بے رحم سے پھر بگڑی
آج کل آپ سے باہر ہے نظاؔم
کچھ تو کہو حال ہے یہ تونے بتایا کیسا
کہیں محفل میں نہ بلوائے گا

معاملہ بندی ادا بندی اردو شاعری میں نظاؔم رامپوری سے قبل جرات اور لکھنوی شعرا کے یہاں یہ وصف پہلے سے موجود تھا لیکن جرائت کی معاملہ بندی میں انداز عمومی ہے۔ان کا کوئی مرکزی یا خاص محبوب نظر نہیں آتا جس کا انھوں نے شاعری میں پیچھا کیا ہو۔اسی وجہ سے مختلف رنگ کی تصویریں ان کے نگارخانے میں موجود ہیں۔اس کے بر عکس نظاؔم رامپوری کا رجحان اور لگاؤ صرف ایک محبوب کی طرف ہے۔اس کی جستجو اور اس کی طرف مرکز بنا رکھا تھا اسی کو حاصل کرنا اگر وہ ناراض ہو جائے تو اسے مانناو ہی تھا مرکز آرزو تھا۔

اس کے علاوہ نظاؔم رامپوری کو معاشی اور سماجی سطح پر مضبوطی نہیں تھی جس سے عاشق کے انداز یا اس کے رجحان کو اور بڑھاوا تمام اپنے مقصد کے حصولیاتی میں مدد ملتی اس لیے ان کے لہجے میں چابک پن موجود نہیں ہے۔اس کے علاوہ معاملات کی جگہ کیفیات کو ترجیح حاصل ہے اور کیفیات نگاری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔نظاؔم رامپوری کا محبوب تو بازار سے تعلق رکھتا ہے لیکن نظاؔم رامپوری نے اس کو پانے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے ان کے اندر جذبہ ہے محبوب کو منانے اور اس کو حاصل کرنے کی قوت موجود ہے۔

قاصد کی بات کا کسے یاں اعتبار ہے
ان کا پھر بھی مجھ کو وہی اعتبار ہے

کیا اپنے جذب دل پہ مجھے اعتبار ہے
بے وعدہ بھی تو روز ترا انتظار ہے
برسوں کی آرزو تھی سو وہ بھی بھر آئے آج
اب کیا کریں کہ وصل میں دل بے قرار ہے
یہ جانتا ہوں ان کو محبت ہے غیر سے
یہ سب پوچھتا ہوں کہ اب کس سے پیار ہے
میں کیوں کہوں کی جاؤ جو جائے ہو غیر کے
یہ مجھے پوچھتے ہو تمیں اختیار ہے
ہمدم نہ کہہ وہ بات جو دل کو بری لگے
اس بے وفا سے گو مری رنجش ہزار ہے
صبح شب وصال یہ کیا یاد آگیا
شرمندہ میں ادھر وہ ادھر شرمسار ہے
ہم سے نہیں نبھی ہے تو غیروں سے نبھ چکی
صدا شکر اس کا عہد نا پائدار ہے
اور اسے ربط بھی ہوئے موقوف بھی ہوئے
اور مجھے آج تک وہی قول قرار ہے
وہ دن گئے کہ سہتے تھے ابتدائے انتظار
اب آرزو بے وصل بھی یہاں دل آوارا ہے
وہ چھوڑ دے گے غیر کو تیرے لیے بھلا
کیوں رے نظام تو تو بڑا ہوشیار ہے

نظام رامپوریؔ نے اس غزل میں اپنے اور محبوب کی پرانی باتوں کو یاد کیا ہے کہتا ہے کہ مجھے محبوب پر آج بھی

اتنا بھروسہ ہے اتنا قاصد پر نہیں ہے۔ ابھی بھی میرا توقع مکمل اسی کی زبان پر ہے اور ہمیشہ بے وقت تمہارا منتظر رہتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ تم نے مجھ سے ملاقات کا کوئی وعدہ نہیں کیا ہے اور جدائی میں دل بے قرار ہو گیا ہے۔ اس کا چوتھا شعر جس میں تجاہل عارفانہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ میرا محبوب کسی اور کو پسند کرتا ہے پھر بھی جان بوجھ کر لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ اب وہ کس سے محبت کرتا ہے محبوب میرا اب کون ہے۔

اس سے پھر کیا گلا کرے کوئی
جو کہے سن کے کیا کرے کوئی
ہم بھی کیا کیا کہیں خدا جانے
گر ہماری سنا کرے کوئی
ہائے وہ باتیں پیار کی شب وصل
بھولے کیا یاد کیا کرے کوئی
لوگ کیوں پوچھتے ہیں حال میرا
ذکر کس بات کا کرے کوئی
درد دل کا علاج ہو کس سے
یوں مسیحا ہوا کرے کوئی
بے وفا گر کہوں تو کہتے ہیں
کیا ہر ایک سے وفا کرے کوئی
جائے گر جان تو سو ہیں تدبیریں
جائے اگر دل تو کیا کرے کوئی
کوئی اپنی خطا تو ہو معلوم
عذر کس بات کا کرے کوئی
دل کا کچھ حال ہی نہیں کھلنا

گر مرض ہو دوا کرے کوئی
کبھی میں بھی کچھ کہا تم سے
نہ سنو کچھ کہا کرے کوئی
تم سے بے رحم پر نہ دل آئے
اور آئے تو کیا کرے کوئی
سینکڑوں باتیں کہہ کہ کہتے ہیں
یہ ہمیں کیوں خفا کرے کوئی
کوئی کب تک نہ دے جواب
چپ کر کب تک سنا کرے کوئی
شکوہ اس بت کا ہر کسی سے نظام
اس سے کہہ دے خدا کرے کوئی

نظاؔم رام پوری کی غزلوں کا ایک وصف یہ ہے، کہ خود کلامی کو بڑے اچھے پیرائے میں شاعری کا جامہ پہناتے ہیں ان کے آثار سے پتہ چلتا ہے، یہ تصوراتی پیکر تراشی اور تمثیلی دنیا کے ہنر مند آدمی ہیں ان کے یہاں معشوق کا تصور بھی حقیقی معشوق کی شکل اختیار کر لیتا ہے معشوق کی بات کو بھی خود کلامی میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ بھی قدیم شعراء میں سے ایک شاعر ہیں، جن کے یہاں عشق حقیقی اور عشق مجازی میں کشمکش ہے جیسے ولؔی اور دردؔ کا عشق حقیقی ہے۔ اور قاری پر ظاہر بھی ہو جاتا ہے، لیکن نظاؔم رامپوری کی غزل میں جو عشق ہے وہ عشق حقیقی اور مجازی کے درمیان حد فاصل نہیں کر پاتا ہے۔ بہر حال ان کی تمام غزلوں میں یکسانیت موجود ہے جن میں اکثر عشقیہ بیان ہے اب ان کی یہ کمی کہی جائے یا اچھائی اگر ہم بڑے شاعروں کو دیکھیں جس میں اچھے خاصے ایسے شاعر موجود ہیں، جن کی نظموں اور غزلوں میں یکسانیت ہے جیسے دردؔ کا تصوف، اور فاؔنی کی زندگی سے بیزاری اور نظام رام پوری کا عشقیہ بیان اس زاویہ سے دیکھیں تو یہ ان کی اپنی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ متذکرہ غزل میں وہ خود کلامی کہ ذریعے اس بات کو پیش کر رہے ہیں کہ معشوق سے کیا گلہ کیا جائے جب ہم اس کے عشق میں اتنے گرفتار ہیں کہ اس سے اپنی کچھ بات نہیں کہہ سکتے اور

ہماری وہ سن بھی نہیں سکتا۔ اگر معشوق کی توجہ ہماری طرف ہو جائے، تو ہم بھی بہت کچھ کہہ سکتے ہیں لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہے، کہ معشوق ہماری طرف توجہ کریں عشق کی خماری معشوق پر کچھ اس طرح سے ہے کہ غزل میں عاشق کا حال پوچھنے سے بھی کتراتے ہیں کیونکہ عاشق معشوق کی یاد میں کچھ اس طرح گرفتار ہوا ہے اس کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا، عشق کے سبب جو پریشانی عائد ہوگئی ہے اس کی دوا بھی کچھ نہیں اور اگر عاشق معشوق کے ستانے اور بے توجہی کے سبب یہ کہے کہ وہ بے وفا ہے تو اس کی طرف سے یہ جواب ہے، میں کس کس سے وفا کروں۔

کوئی اپنی خطا تو ہو معلوم
عذر کس بات کا کرے کوئی
دل کا کچھ حال ہی نہیں کھلنا
گر مرض ہو دوا کرے کوئی
کبھی میں بھی کچھ کہا تم سے
نا سنو کچھ کہا کرے کوئی
تم سے بے رحم پر نہ دل آئے
اور آئے تو کیا کرے کوئی
سینکڑوں باتیں کہہ کہ کہتے ہیں
یہ ہمیں کیوں خفا کرے کوئی
کوئی کب تک نہ دے جواب
چپکا کب تک سنا کرے کوئی
شکوہ اس بت کا ہر کسی سے نظام
اس سے کہہ دے خدا کرے کوئی

اس غزل میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ جس معشوق سے عاشق اپنی چاہت کا اظہار کرتا ہے اس کے چاہنے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں یہ غزل عاشق کو عشق حقیقی کی طرف لے جا رہا ہے۔ کیونکہ اللہ سے محبت کرنے

والے بندے بہت زیادہ ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ تمام مخلوق اللہ سے محبت کرتی ہے، لیکن اللہ ہر کسی کو آزمائش میں نہیں ڈالتا، اس طرح ہرجائی کا لفظ علامہ اقبال نے بھی اللہ کے لئے مستعمل کیا ہے۔ اور کبھی اسے حقیقی منتظر میں اللہ سے شکوہ شکایت بھی کیا ہے۔

بہرحال متذکرہ باتوں میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ نظام کا عشق تذبذب کا شکار ہے اس میں عشق حقیقی عشق مجازی کا دروازہ کھلا رہتا ہے، شاعر غزل میں یہ بھی کہتا ہے کہ عاشق اپنی خطا مان لے گا لیکن اسے اپنا کوئی گناہ پتہ ہی نہیں چل رہا ہے، تو پھر عذر کس بات کا کرے اس سے معشوق کی حددرجہ بے رخی کا پتہ چلتا ہے، کیونکہ عاشق کی طرف سے کبھی محبت میں کوئی کمی یا دکھاوا نہیں ہے، اس شعر سے ملاحظہ فرمائیں۔

کوئی اپنی خطا تو ہو معلوم
عذر کس بات کا کرے کوئی

اس طرح سے نظاؔم رامپوری اپنی پرانی غزلوں کی روشنی میں اس غزل میں بھی کہہ رہے ہیں کہ اتنی بے رحم معشوق پر کسی کا دل نہ آئے اور اگر آ گیا تو کوئی کچھ بھی کر نہیں سکتا ہے اور درد کا علاج سوائے موت کے کچھ نہیں بت سے شکوہ کرنا جس میں کہ کوئی حرکات وسکنات نہیں ہیں، بے معنی ہے اس طرح معشوق سے اپنے دل کی بات کہنا بے معنی ہے جس کے دل میں عاشق کے لئے نہ محبت ہے نہ رحم ہے پوری غزل میں عاشق نے محبوب سے شکوہ شکایت کی ہے۔

وہ ایسے بگڑے ہوئے ہیں کئی مہینے سے
کہ جان پہ بن گئی تنگ آگیا میں جینے سے
ہوئی نمود جو پستان جو شرم کہاں کے کہاں
یہ کیا بلا ہے جو اٹھی ہے میرے سینے سے
وہ دور کہ چکے شب وصل اس کا یہ کہنا
کوئی ادھر ہی کو بیٹھا رہے قرینے سے
جو بوسہ دیتے ہیں لب بچا لیتے ہیں لب سے

لپٹے بھی ہیں سینہ چورا کہ سینے سے
وہ ساتھ سونا کسی کا وہ گرم جوشی ہائے
نمی وہ جسم کی چولی وہ تر پسینے سے
خوشی بھی ہے کہ ایک دن غم سے چھوٹے گے
نہ موت آئی تو کیا حاصل اسے جینے سے
وہ نیچی نیچی نگاہوں سے دیکھنا مجھ کو
وہ پیار تکیے کو کرنا لگا کے سینے سے
یہی وہ راہ ہے جو دل سے دل کو ہوتی ہے
حصول کون سا چاک جگر کے سینے سے
میں اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ سن رہی ہے
عدو کا دل ہے لباب حسد سے کینے سے
خدا کی شان ہے یہ بات اور منہ اس کا
نظام پھر کرو توبہ شراب پینے سے

نظام رامپوری کی یہ غزل ایک ایسی غزل ہے جس میں کھلا پن ہے جو عشق مجازی ہے اور ایسا عشق مجازی ہے جو جنسی روابط سے حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ غزل ان کے پرانے روش پر ہے وہ عشق میں جنس کا سہارا لے کر کچھ ایسے فلسفے کو پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے کچھ ایسے انسانوں کے بارے میں پتہ چلے جن کے اندر ریا کاری ہے اندر سے بھی اور باہر سے بھی، کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اندر سے کچھ اور، اور باہر سے کچھ اور ہوتے ہیں ۔ برائیوں کی حد کرتے ہیں اور پھر نیک بنتے ہیں ۔ جیسے یہ شعر دیکھئے

ہوئی نمود جو پستان جو شرم کہاں کے کہا
یہ کیا بلا ہے جو اٹھی ہے میرے سینے سے

اس شعر میں پستان کو ظاہر کرنے کے بعد شرم کے کوئی معنی نہیں ہے اس طرح کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو برائی

کرنے کے بعد میں نیک بنتے ہیں اوراس طرح وہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ عشق میں جنسی خواہشات اس درجہ ہوتی ہیں کہ بوسہ دیتے ہوئے بھی ہونٹوں پرنہیں دیتے ہیں، لیکن وہی کہیں کہیں اوران کے ساتھ سینہ چورا کر کے سینے سے لپٹے ہوئے ہوتے ہیں اور کہیں کہیں دوسرے سے سینہ سے سینہ ملا کر لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس شعر میں وہی ریا کے فلسفے کو پیش کیا گیا ہے جس میں دکھاوے کی ظاہری طور پر اچھا ہونا ظاہر کیا گیا ہے بہرحال نظاؔم رامپوری کا یہ اپنا سلیقہ ہے اپنی علامت سے کوئی بات بتانا بعید از قیاس بھی ہوسکتا ہے لیکن غزلوں کی سیاق وصداقت سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے عشقیہ بیان کا سہارا لے کر زندگی کے فلسفے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے بس اس غزل کی یہ خصوصیت ہے کہ نظاؔم رامپوری جہاں اورغزلوں میں عشق سے مایوس اور معشوق سے دوری کے شکار ہوتے ہیں اس غزل میں وہ معشوق کی وصل کی سی لذت سے ہمکنار ہیں اور کہہ رہے کہ اس کے جانے پر ان کے دل میں کسک باقی رہتی ہے اوران کا معشوق سے ملنا دشمن کو برا لگتا ہے اور وہ حسد تک پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اورغزلوں میں ہجر کا رونا روتے ہیں اوراس میں معشوق کی وصل عاشق کو نصیب ہوئی ہے اس طرح سے ان کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ پوری طرح سے رجائیت کے شاعرنہیں ہیں ان کے اندر بھی آس وامید برقرار ہے جو میں نے ان کی شاعری میں کچھ الگ محسوس کیا شاید شاعری میں نہ ملے وہ مجھے لگ رہا ہے کہ ان کے یہاں شاعری میں بھی کردار نگاری ہے اور وہ کردار نگاری اس طرح سے ہے کہ وہ عاشق ومعشوق سے وہ کلمات ادا کروائے یا خود کلامی کے ذریعے پیش کیے گئے جس سے ایسا لگتا ہے کہ ظاہری طور پر کوئی آدمی اپنے دل کی جذبات کوکسی سے بیان کر رہا ہے اوراس پر کیا کیا گزری ہے اس روداد کولوگوں کو سنا رہا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ کردار سے افعال کم مل رہیں کیوں کہ یہ شاعری ہے اور شاعر کو شاعری کے حصول میں رہنا پڑتا ہے یہ نظاؔم رامپوری کی اپنی خصوصیت ہوسکتی ہے۔

نظامؔ رام پوری اور داغؔ دہلوی

نظامؔ رام پوری اور داغؔ دہلوی دونوں ایک وقت میں رام پور کے دو مشہور شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ داغ عمر میں نظامؔ رام پوری سے آٹھ سال چھوٹے تھے اور شاعری کی ابتدا میں نظامؔ رامپوری سے اولیت لے گئے مگر نظام رامپوری نے 49 سال کی عمر پائی اور داغؔ دہلوی ۷۵ سال کی عمر میں اس دنیا سے چلے گئے داغؔ دہلوی شروع میں کبھی کبھی رام پور آیا کرتے تھے، مگر ۱۸۵۸ء میں مستقل قیام کرلیا۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۸۸ء تک رام پور کی مجلسوں میں شرکت کرتے رہے، اسی دوران نظامؔ رام پوری کا انتقال ہوگیا۔ دونوں نے سولہ سال مسلسل ایک دوسرے کے ساتھ رام پور میں وقت گزارا کبھی کبھی دونوں رام پور کے لوگوں کو شعر و شاعری کی طرف رغبت دلاتے رہے نظام ایک مفلوق الحال، مفلس، کم تعلیم یافتہ اور قناعت پسند مگر نسبتی اعتبار سے غوث الاعظم کی نسل سے تھے، لیکن ان کی معاشی حالت ابتدا سے کمزور تھی صرف کم تنخواہ کی وجہ سے اسکے برخلاف داغؔ دہلوی اس زمانے کے بادشاہوں میں شامل تھے۔ سماج کے اعلیٰ طبقہ سے ان کا تعلق تھا، اس زمانے کے بلند پایہ عالموں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وہ بھی ایسی جگہ جس کا نام لال قلعہ تھا، وہاں شہزادوں اور شہزادیوں سے اردو معلیٰ سیکھی۔ ذوق جیسے بلند مرتبہ شاعر کی شاگردی نصیب ہوئی، اور موسیقی اس دور میں بلند مقام حاصل کر چکی تھی، اس دور کے موسیقی کے بڑے استاد جو قلعہ میں موجود تھے، ان سے موسیقی کا علم بھی حاصل کیا، بیشتر زندگی عیش و عشرت میں گزری اور زندگی میں بلند و بالا خطابات سے بھی نوازے گئے۔

داغؔ دہلوی انتہائی ذہین، خوش طبع، دور اندیش شخصیت کے مالک تھے وہ آنے والے زمانے کے لئے اپنا مستقبل سنوار رہے تھے، ہر طریقے کی ضروریات ان کے پاس دستیاب تھیں کچھ سال رام پور میں بسر کرنے کے بعد حیدرآباد میں بھی پر سکون زندگی بسر کی، داغؔ کو رام پور میں بھی ۷۰ روپے ماہانہ گھوڑوں کے اصطبل کی دیکھ ریکھ کے عوض میں ملتا تھا، اس کے برعکس نظامؔ رامپوری کی تنخواہ صرف دس روپے ماہانہ تھی۔ دونوں کی تنخواہ اور عہدے میں زمین اور آسمان کا فرق تھا اس وقت رام پور میں بہت سے معتبر اساتذہ اکرام لکھنو اور دہلی دونوں جگہ کے موجود تھے

نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خان دونوں کے دور حکومت میں ان لوگوں کو عزت و پیسہ وعہدہ تمام چیزوں سے دل کھول کر نوازا گیا ان میں امیرؔ، داغؔ، جلالؔ، اسیرؔ، منیرؔ، شاغلؔ، بیمارؔ، قلقؔ، بہر حال ان کے علاوہ بھی عظیم الشان شعرا یہاں موجود تھے۔ اوران کو سو روپیہ الگ سے ماہانہ دیا جاتا تھا۔ لیکن ریاست رام پور کے شعرا دربار سے منسلک ہونے کے باوجود بھی وظائف اور عہدے ئے سے محروم تھے مقامی شعراء میں ایک نظامؔ رام پوری بھی تھے، استاد احمد علی رسا جیتے جی رام پور کے نوابوں نے ان پر بہت کم دھیان دیا مگر ان کی وفات کے بعد ان پر دھیان دیا، گیا وہاں کے نواب رام پور کا قاعدہ تھا کہ مقامی ارباب فن کو زبانی نوازتے تھے اسی زبانی نوازنے کی وجہ سے ان شاعروں پر ہمیشہ غربت چھائی رہی۔

داغؔ دہلوی اور نظامؔ رامپوری کی غزلوں پر ایک تقابلی نظر ڈال لی جائے۔

شہر میں نظامؔ رامپوری کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا اب اسے استاد کا درجہ حاصل تھا اس کے شاگرد اس کی رنگ شاعری کو فروغ دے رہے تھے۔ اس کی شاعری میں کوئی گہرا فلسفہ نہیں تھا لیکن سادہ زبان میں جزباتیت کی رنگ آمیزی نے اپنا سماں باندھ دیا تھا کہ جو سنتا تھا اس کا والہ وشیدا ہو جاتا تھا۔۔ نظام نے مشاعروں میں جانا کم کر دیا تھا

محمد رضا کے گھر پر یہ داغؔ دہلوی کا پہلا مشاعرہ ہوا دہلی سے آنے کے بعد رامپور میں پڑھ رہے تھے۔ اس مشاعرے میں نظامؔ رامپوری بھی اپنا کلام پڑھنے آئے تھے۔

لیکن اس مشاعرے میں نظامؔ رامپوری کے شاگرد انہیں گھیر کر لے ہی گئے وہ مشاعرے میں پہنچے تو اس وقت داغ دہلوی اپنی اس غزل کو پڑھ رہے تھے۔

بھولے بھٹکے جو تیرے گھر میں چلے آتے ہیں
اپنی تقدیر کے چکر میں چلے آتے ہیں
وحشت ایسی ہے کہ سائے سے بھی میں کہتا ہوں
آپ کیوں میرے برابر میں چلے آتے ہیں

زبان آسان تھی لیکن اس غزل میں کوئی شعر اس رنگ کا نہیں تھا جس کے لیے وہ آگے چل کر مشہور ہونے والا تھا نظامؔ رامپوری کی باری آئی۔

اس کا گلہ نہیں نہ ہو وعدہ وفا نہ ہو
اتنا تو ہو کہ رشک مجھے غیر کا نہ ہو
انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

شاعر کے ہونٹوں سے اس شعر کا ادا ہونا تھا کہ محفل میں ہر طرف سے داد دی جانے لگی، ایسی تصویر کشی کی تھی کہ دشمنوں نے گھر جا کر آئینہ دیکھا ہوگا۔

پھر نظآم رامپوری سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے حضرات اب آپ ملاحظہ کیجیے میں نے آئندہ شعروں میں ایک ہی قافیہ کو کتنے انداز دیتے ہوئے باندھا ہے۔ واہ واہ کی آوازیں آنے لگیں

اٹکھلیوں سے چلتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
اس کا وہ نیچی نیچی نگاہوں سے دیکھنا
اب میں ہوں تم ہو کون ہے کس کا لحاظ
کیا اس کا ذکر ہے کوئی دیکھتا نہ ہو
ایک لطف روز کے ہے سوال و جواب میں
ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ وعدہ وفا نہ ہو
پھر کیا گلا ستم کا کریں جب وہ کہیں
ہاں ہم تو ایسے ہیں کوئی پھر مبتلا نہ ہو
کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام
ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

مشاعرے میں سب کا حال جو تھا سو تھا داآغ دہلوی تو ایسے تصویر بن کر دیکھ رہے تھے۔ اس نے اب تک انھوں نے شاعری سنی تھی شاعری مصوری کیسے بنتی ہے آرٹ کے نمونے میں کب بدلتی ہے یہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا یہ موقع

انہیں رام پور میں مل رہا تھا داغ دہلوی گھر پہنچے تو نظام رامپوری کا یہ شعر اس کی زبان پر تھا۔

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

اے اللہ بڑا اچھا شعر ہے ہمیں دیکھ کر ہوا ہے ان کی بیوی نے پوچھا۔ داغ نے فرمایا فاطمہ بیگم حق بات تو یہ ہے کہ ایسا شعر ہم کہہ نہیں سکتے۔

ذوق کے شاگرد داغ دہلوی کے کلام پر بھی دہلوی کا اثر نمایاں تھا۔ ذیل میں ان کے چند اشعار جن پر دہلویت کا رنگ غالب ہے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے پہلے دیوان گلزارِ داغ میں شامل ہیں جو رامپور سے ۱۸۷۸ ای شائع ہوا تھا۔

اس کی قسمت میں ہے واژدا نی ازل کے روز سے
عقل اوندھی کیوں نہ ہوئی آسماں پیر کی
جستجو زہرر ہے گر حاصل مطلوب نہ ہو
اب حیوان نے کئے تلخ سکندر کے مزے
کشتگان آبروئے پرخم کی دلوادو نیاز
تم نے رکھی ہے کما اول ہی اول دوش پر
بل بے نیاز عشق کے پیکان دلنشین
اک اشک بن کے دیدہ تر سے نکل گیا

ایسے اشعار کی تعداد گلزار داغ میں بہت ہے اور ان کے دیوان دوم جو اٹھارہ سو پچاسی ۱۸۸۵ء میں رام پور سے شائع ہوا تھا، اس میں بھی اس طرح کے شعروں کی تعداد کافی ہے حالانکہ بہت سے اشعار سادہ اور سلیس انداز میں بھی موجود ہیں مگر ان میں وہ لطافت اور شگفتہ کیفیت نہیں جو بعد میں داغ کی شہرت کا سبب بنتی۔

1857 کے بعد دیگر سماجی علوم میں انقلاب آیا تو اردو زبان بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہی۔ دہلی اور لکھنو کے شاعر جو بادشاہوں کی جانب سے وظیفہ پاتے تھے، اور خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے اور اس وظیفہ کے

ذریعے خوشنودی طبع کا سامان مہیا کر رہے تھے، بادشاہوں کی شان میں قصیدہ کہہ رہے تھے وہ اس تباہی سے بہت نقصان میں رہے نوکری بھی چلی گئی اور انہوں نے در بدر کی ٹھوکریں کھائیں یہ وہ لوگ تھے جو درباروں میں مشاعرے کرتے تھے درباروں اور رئیسوں کی حویلیوں میں ایک بہترین زندگی بسر کر رہے تھے جب دہلی اور لکھنؤ کی محفلیں اجڑ گئیں تو ان شاعروں میں بے چینی اور اضطراب اور معاش کی فکر نے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا اس وجہ سے شاعروں میں بھگدڑ کی نوبت آ گئی جس کو جہاں موقع ملا وہاں جا پہنچا دہلی اور لکھنؤ کے بیچ ایک ریاست رام پور تھی جہاں پرسکون اور امن تھا اس کے ساتھ مشاعروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا اس وجہ سے یہاں دہلی اور لکھنو دونوں جگہ کے شاعر جمع ہو گئے۔

نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خاں یہ دونوں خود بھی شاعر تھے اور شاعروں کے ساتھ ہمدردی بھی کیا کرتے تھے ریاست رام پور میں جو بھی شاعر دور دراز سے آتے تھے یہ ان شاعروں کا وظیفہ مقرر کرتے رہے ان کو عزت واحترام سے زندگی بسر کرنے کا موقع دیتے رہے وہ انتہا درجے کے ادب پرور عالی، حوصلہ افزائی، مہمان نوازی اور کشادہ رئیس دوست تھے، رام پور کے نوابوں نے ان پریشان حال شاعروں کو خوش آمدید کہا اور اپنے درباروں میں جگہ دی اور اپنے درباروں کی زینت بھی بنایا ان شاعروں سے قبل بھی رامپور میں شعر وسخن کا آغاز ہو چکا تھا اور مشاعروں میں لوگوں کی شرکت ہوا کرتی تھی اس کے علاوہ نوابوں کے محلوں میں بھی شعر وشاعری کے پروگرام ہوا کرتے تھے مگر ان لوگوں کی آمد سے رام پور کی شاعری میں چار چاند لگ گئے شعر وسخن کا جو دربار تھا اس میں جو لوگ شریک ہوتے تھے یہ افغان کے علاقہ روح سے آنے والے افغانی تھے انہوں نے کافی جدوجہد کے بعد اس محفل کو آباد رکھا اور کوئی بھی محفل آباد تب تک رہتی ہے جب اس کے چاہنے والے موجود ہوں کیونکہ یہ علاقہ روہیل کھنڈ میں آتا تھا اور یہاں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی یہ وہ دور تھا کہ جب نواب اور عوام کا ذاتی رشتہ بھی قائم ہوا تھا بلکہ استوار اور مضبوطی سے قائم ہوا تھا۔

آج پھر برہم ہیں وہ کافر مزاج
اس کو شاید کوئی کچھ سکھلا گیا

نواب محبت خان محبتؔ

گر وقت ذبح نالہ کیا میں تو کیا ہوا
پیار کسی کا ہاتھ کسی کی زبان چلے

محمد یار خان امیرؔ

اب کیا

رہا ہے جس پہ رقیبو ں کا ڈر کریں
تم تو بروں کی جان کو پہلے ہی رو چکے

قدرت اللہ شوقؔ

بستر کیا ہے قیس کے بستر کے سامنے
بیٹھے ہیں ہم تو اپنے برابر کے سامنے

اللہ داد طالبؔ

تاب و تواں و صبر و دل زار چل بسے
تھے اپنے اس جہان میں جو غم خوار چل بسے

کبیر اللہ تسلیمؔ

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

نظامؔ رامپوری

وہی تم ہو وہی خنجر ہے پر انصاف کرو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

نواب یوسف علی خاں ناظمؔ

لوگ کس طرح سے کرتے ہیں خدا کو راضی
مجھ سے تو ایک بت کافر بھی منایا نہ گیا

غلام احمد تمیزؔ

داغؔ دہلوی وہ چنندہ اشعار جوانہوں نے رامپور میں ابتدائی دور میں پڑھے تھے۔

قتل ہونے نہ دیا شکرے جفا نے مجھ کو
کام آتے ہیں برے وقت میں اوسان بہت
گیا ہے عرش معلیٰ پر شعور نالوں کا
خدا بھلا کرے آزاد دینے والوں کا
تری درد حنا نے مایہ صبر و خرد لوٹے
تیری برق نگاہ خرمن تاب وتواں پھونکا
تیری اتری ہوئی مہندی جو اسے ہاتھ لگے
یہ ید بیضا، کانشاں پنجہ محرم میں ہے

یہ ان کے اشعار ہیں، اس وقت رامپور کا جو ماحول وشعروسخن تھا اس میں شامل مقامی شعراء جو پہلے ہی سے اس کام کو اپنے دامن سے جوڑے ہوئے تھے ان میں احمد علی احمدؔ، نظامؔ، تمیزؔ، احمد علی رساؔ اور حشمت علی خاں موجدؔ وغیرہ دادسخن دے رہے تھے ان تمام لوگوں میں نظامؔ رام پوری کا نام سب سے زیادہ شہرت یافتہ تھا۔ جب داغؔ نے نظام کا کلام دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ رامپور میں کس طریقے کا کلام لوگ پسند کرتے ہیں یہ چیزیں داغ نے نظام کے ذریعے سیکھی ،بقول نیاز فتح پوری۔

''نظام کو سوز اور جرات کا مقلد کہا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک مصوّری کے لحاظ سے یہ بعض مقامات پر جرات سے بڑھ جاتے ہیں اور جذبات نگاری کی حیثیت سے تو نظامؔ کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ وہاں تک سوز وجرات کا خیال بھی نہیں پہنچتا۔''5

ممتاز تنقید نگار عابد علی عابد اپنی تصنیف شعر اقبال مطبوعہ بزم اقبال لاہور میں فرماتے ہیں کہ۔

''رام پور میں داغ کا کلام کسوٹی پر کسا گیا ہے۔انہیں بہت سنبھال کر شعر کہنا پڑا کہ روزمرہ کے محاورے اور مفردات کلمات کے نقاد نقطہ چینی پر

تیار بیٹھے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر داغ کو رام پور کی علمی محفلیں
نصیب نہ ہوتی تو ان کی فنکاری ناقص رہتی۔"6

جب داغ رامپور آئے تو باریک بینی سے یہاں کے عوام اور درباری رجحان کا اندازہ لگایا اس وقت رامپور کے مقامی شاعر احمد رسؔا اور نظاؔم رامپوری یہ سب اچھے شاعر مانے جاتے تھے تو داغ زیادہ تر نظام رامپوری کے رنگ سے متاثر ہوئے، نظاؔم رامپوری نے ادا بندی اور جذبات کو اپنی شاعری میں ایک الگ انداز سے پرویا ہے۔ جس کو داؔغ دہلوی نے دوسرے محاسن شاعری کے ساتھ بھرپور طریقے سے اپنا لیا اور ان سے استفادہ کیا اور امیر مینائی نے لکھنؤ کا طرز انداز فرسودہ شاعری ترک کر کے یہاں کا رنگ اختیار کرلیا لیکن امیر مینائی کی بہ نسبت داؔغ دہلوی مکمل طور پر اپنی شاعری میں نظام کا تتبع اور خوشہ چینی کرتے نظر آتے ہیں، اور اسی رنگ سخن کو اپنا محبوب رنگ سمجھ کر اپنی شاعری میں ڈال لیا، اسی رنگ سخن کو اپنا محبوب رنگ سمجھ کر اپنی ذہانت اور قادرالکلامی کی بدولت ایک ترقی یافتہ شکل میں پیش کر کے دنیائے شعروادب میں ایک لازوال مقام حاصل کرلیا، رام پور میں داؔغ دہلوی کے ممتاز ترین شاگرد اور جانشین بھی موجود ہیں۔ نظاؔم رامپوری کو ملکہ حاصل تھا معاملہ بندی اور ادا نگاری میں ساتھ ساتھ واردات قلب، کیفیات وصل وفراق اور جذبات کی مصوری میں اس وقت حالات کے مطابق تقلیدی اور روایتی رنگ کی شاعری مستقبل میں ان کی فکر وفن کو ان کا صحیح مقام عطا کرنے میں معاون ثابت نہ ہوسکے گی اس لیے انہوں نے نظام کے رنگ سخن کو نہ صرف مکمل طور پر اپنایا بلکہ اپنی موجودہ طبع سے اپنے اشعار میں چھیڑ چھاڑ، چھین جھپٹ، طعنہ وتشنیع، شوخی، زندہ دلی اور چلبلاہٹ کی مزید آمیزش کر کے اس دور کی شعر گوئی کو ایک نئی سمت عطا کی جس کی بدولت انھوں نے فصیح الملک کا درجہ حاصل کرلیا۔

داغ نے مذکورہ بالا رنگ سخن شعروادب میں مکمل طور سے اپنے لیے مخصوص کرلیا، داؔغ دہلوی کے بہت سے شاگرد تھے۔ جس میں سے احسن مارہروی، نوح ناروی، جوش، سیماؔب اکبرآبادی، ڈاکٹر اقباؔل، استاد محموؔد رامپوری اور نسیم بھرتپوری وغیرہ وغیرہ جو نا صرف داؔغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ بلکہ ان کے بعد خود بھی ملک کے اہم اور معتبر استادوں میں شامل رہے۔ اور ان تمام اساتذہ سے بھی تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے۔ تمام بات کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے۔ کہ داؔغ دہلوی نے اپنے استاد ابراہیم ذوقؔ اور دہلی کی تقلید کا رنگ ترک کردیا اور روایتی شاعری کو رامپور میں آکر چھوڑ دیا، تو وہ اور ان کے بعد کے تلامذہ در تلامذہ وہی سادہ اور شوخ طرز سخن اپناتے رہے، جو داغ نے رام

پورا کر پایا اور اپنایا تھا۔ سیماب اکبر آبادی اور ڈاکٹر اقبال نے کچھ حد تک اس طرزِ سخن اسلوب سے دوری اختیار کر لی تو اسے ضرور نظام کا عطیہ کہا جائے گا۔

اٹھارہ سو بہتّر میں نظام کا انتقال ہوا تو داغ رامپور میں بطور مہمان و ملازمت پندرہ سال تک رہے۔

داغ اور نظام کے کلام کے چند نمونے

یہ اپنا حال کیا ایسا انتظار کیا
یہ کیا کیا تیرے کہنے پہ اعتبار کیا
وہ تو یوں ہی کہتا تھا کہ میں کچھ نہیں کہتا
میرا یہ مقولہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
آج کہتے ہو مدعا کہیے اس تغافل کو کہیے کیا کہیے
کہتے ہیں کس ادا سے وہ سن ماجرا دل
گر کوئی ایسا جانیں تو کیوں لگائے دل

نظامؔ رام پوری

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا
یہ قول کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
وہ کچھ نہیں کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ناروا کہیے ناسزا کہیے
کہیے کہیے مجھے برا کہیے
کیونکہ کے دل کا حال کریں ہائے ہائے دل
اچھی کہی کہ ہم سے کہو ماجرائے دل

داغؔ دہلوی

اب چند اشعار ہم قافیہ اور ہم ردیف اور یکساں خیالات کے ہیں جو ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

جو منظور اور ظلم ہے تو پوچھنا ہے کیا
کیوں حال پوچھتے ہو میرا بار بار آج
نگاہ ناز کا بسمل وہ مجھ کو جان گئے
ہزار ضبط کیا سو طرح چھپائی چوٹ
یوں غیر ستائیں مجھے اور کچھ نہ کہوں میں
منہ مجھ کو تمہارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اب نہ وعدہ کرو کیوں مفت ندامت ہو بہم
مجھے نسیان تمہیں سہو کسے یاد رہے
سحر کی دعائیں نہ مانگوں ابھی
نہ گھبراو باتوں میں جائے گی رات
کیا نہ کی وصل میں ضد کون سی کی میری خوشی
اور کیا اس سے زیادہ شب ہجراں ہوگا

نظامؔ رام پوری

شاید لگی ہے ان کو میرے نزاع کی خبر
وہ پوچھتے ہیں حال میرا بار بار آج
سلام میں نے کیا رکھ کے ہاتھ سینے پر
وہ جانتے ہیں مجھے دیکھ کر چھپائی چوٹ
سن سن کے تیرے عشق میں اغیار کے طعنے
میر اہی کلیجا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
باہم ایک وعدہ فردا پہ نوشتہا ہو جائے

کہ مجھے سہو کی عادت ہے مجھے یاد رہے
نہ میں بات کرتا اگر جانتا
کہ یوں بات کرنے میں جائے گی رات
جس قدر آج ستاتا ہے ستائے ہم کو
روزے محشر بھی تو کل اے شب ہجراں ہوگا

داغ دہلوی

اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ اردو ادب نے نظام رامپوری کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا مگر نیاز فتح پوری کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے رسالہ نگار لکھنؤ 1924ء میں ایک مضمون نظام رامپوری پر لکھا جس کے ذریعے انہوں نے اردو دنیا سے نظام رامپوری کو متعارف کرایا کہ وہ بھی دارالسرور رامپور کا ایک باکمال شاعر تھا۔ 1872 میں نظام رامپوری کا انتقال ہوا، اور 1924 میں ان پر پہلا مضمون لکھا گیا، اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ بڑے افسوس کا مقام ہے۔ کہ داغ دہلوی نے نظام رامپوری کے ساتھ پندرہ برس مسلسل کام کیا۔ اور ساتھ میں گزارے مگر کہیں انہوں نے نظام رامپوری کا ذکر تک نہیں کیا ان کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر بلاشبہ اپنی ذہانت اور صلاحیت کی بدولت فصیح الملک اور دبیرالدولہ قرار پائے اس کے باوجود بھی کسی شعر کسی نثری تحریر یا اپنے خطوط میں نظام رامپوری کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔

نظام رامپوری کو ادبی اور عوامی سطح پر بہت یاد کیا جاتا ہے۔ رامپور کے مقامی معمار ہمیشہ ملک کی ادبی سطح پر نظر انداز کیے جاتے رہے ہیں۔ نظام رامپوری مفلوق الحال اہل وطن اور نوابین رامپور کی عدم توجہی اور ارباب علم کی بے خبری کا پوری عمر شکار رہے انھوں نے اس کی شکایت اپنے ان اشعار کے ذریعہ کی ہے۔

دل کی حالت کہی نہیں جاتی
سانس بھی اب تو لی نہیں جاتی
دم آخر تو آؤ ایک دم کو
مفت یوں جان دی نہیں جاتی

اب ستم بھی سہا نہیں جاتا
اور شکایت بھی کی نہیں جاتی
صبح ہونے کو آئی رات گئی
ابھی ضد آپ کی نہیں جاتی
واں کا جانا تو چھوٹا برسوں سے
لیکن الفت ابھی نہیں جاتی

مذکورہ بالا اشعار میں نظامؔ رامپوری نے عشق کی کیفیت کو مختلف ہیجان کے ساتھ بیان کیا ہے اور بتایا کہ وہ اپنے محبوب کی محبت میں اس طرح سے گرفتار ہیں کہ وہ اس کا بیان نہیں کر سکتے اس پر تصادم و کشمکش کی شکل اختیار کر چکا ہے جس میں اس کی حالت اس طرح سے ہوئی ہے۔ کہ وہ اپنی چاہتوں، ارادہ اور خوشی کا انکشاف بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی محبوب کی بے رخی سے، دکھ، والم کی حالت یہ ہے۔ کہ جینا بھی محال ہے اور شاعر نے ان اشعار میں عشق کی کیفیت کو اس طرح سے اپنی شاعری میں پیوست کیا ہے کہ محبوب کے ستم سے اندر اندر تو پریشان ہیں پر زبان سے اس کی شکایت نہیں کرتے۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ عشق میں اس طرح ملوث ہو چکا ہے کہ محبوب کو کچھ محسوس نہیں ہونے دیتا کیوں کہ انسان کی خصوصیت میں سے ہے۔ کہ اگر اس پر ظلم وستم ہو تو اس پر شکایت آہ و بقا کرتا ہے لیکن شاعر کہتا ہے ستم سہا بھی نہیں جاتا اور شکایت بھی نہیں ہوتی۔

مجھ میں ان میں جو کچھ کدورت ہے
جائے گی پر ابھی نہیں جاتی
ہائے اس کا بگاڑ کے یہ کہنا
یہ تو عادت میری نہیں جاتی
لیکن الفت ابھی نہیں جاتی
اور سے میں کچھ کہہ نہیں سکتا
ان سے تقریر کی نہیں جاتی

بات ہی ایسی سنی نہیں جاتی
روز یاں ہجر میں ہے حال یہی
جان کچھ آج ہی نہیں جاتی
یہ میرا حال اور نظام ان تک
خبر اس بات کی نہیں جاتی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوبہ کی محبت میں شاعر عشق کے آخری درجے کو پہنچ چکا ہے۔ان کی یہ پوری غزل عشقیہ بیان اور تغزل کی بہترین مثال ہے۔جس میں وہ محبوبہ کی یاد،عشق التفات اور دوری وصل کو بیان کرتا ہے۔عشق و عاشقی میں جو انسانی افعال واقوال در پیش ہوتے ہیں۔وہ بھی شاعر نے صفحہ قرطاس پہ لایا ہے۔جس طرح انسان میں وقتی طور پر کچھ ان بن یا کچھ نہ سمجھی اور غلط فہمی ہو جاتی ہے۔لیکن وہ اس امید پر رہتا ہے کہ جلد ہی یہ غلط فہمی شکایت دور ہو جائے گی۔شاعر اپنے التفات کی طرف متلاشی ہے اور اسے یقین ہے۔کہ ایک دن محبوب کی ساری توجہ میری طرف مرکوز ہو جائے گی ساتھ ہی ان چھوٹے چھوٹے رموز کو بھی شاعری میں پیش کیا ہے۔جس میں معشوقہ کے ناز ونخرے ہیں۔

ہائے اس کا بگڑ کر یہ کہنا
یہ تو عادت میری نہیں جاتی

بار بار کچھ نہ کچھ شکوہ شکایت معشوق کی طرف سے ہوتے رہتے ہیں۔اور عاشق اپنے معشوق کے ہجر میں تڑپتا رہتا ہے۔اور اس حالت کو پہنچ جاتا ہے۔کہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جان کچھ آج ہی نہیں جاتی، عاشق کی یہ حالت ہے۔کہ پریشان زدہ ہے وہ بے کاری کا شکار ہے۔لیکن معشوق کو نہ اس کا احساس ہے اور نہ ہی یہ خبر ہے۔محولہ ساری باتیں نظاؔم رامپوری کی غزل کی ترجمانی کہ طور پر پیش کی گئیں ہیں۔لیکن اس میں خاص بات یہ ہے۔کہ نظام رامپوری کی شاعری میں عشقیہ بیان اس طرح سے ہے۔کہ اس میں شگفتگی، سنجیدگی، رمز و کنایہ، ناز ونخرے سب موجود ہیں جو غزل کے وصف کو اجاگر کرتے ہیں۔

دنیا کی سر پہ آفتیں لیں تیرے واسطے

کیا کیا سہا نہ دشمن نے دیں تیرے واسطے
لب بند ہو گئے مرے عالم غشی کا ہے
آنکھیں کھلیں رہیں تو رہیں تیرے واسطے
آئیں گے ایسے صدمے تو کچھ تو کریں گے پھر
جائیں گے ہم کہیں نہ کہیں تیرے واسطے
تدبیر کس کی اب تو ہے تقدیر میں کلام
اس درجے میں نے کوششیں کی تیرے واسطے
ظاہر یہ سب پہ ہے نہیں اچھا کسی کا ذکر
بدنام ایک ہوئے تو ہیں تیرے واسطے

نظامؔ رام پوری کی یہ غزل اپنے عشقیہ بیان کے ساتھ عاشق کے جذبات کو اس طرح سے اجاگر کرتی ہے۔ عاشق معشوق کی یاد اور اس کی خاطر دنیا کی تمام مصیبتوں کو اپنے سر لے سکتا ہے۔ پر معشوق کی ناراضگی اسے برداشت نہیں۔ اپنے عاشق کی عشقیہ شدت کا بیان نظامؔ رام پوری نے اس طرح سے کیا کہ عاشق بے ہوش رہتا ہے لیکن اپنے معشوق کے لئے اس کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور اس کی یاد میں اسے جو تکلیف اور درد ہوتا ہے اس کے سبب وہ اپنے آپ کو کہیں ایک جگہ نہیں پاتا۔ اسے بے چینی اور بے قراری کچھ اس طرح سے رہتی ہے کہ یہاں وہاں پھرتا رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عاشق اپنے معشوق سے ملنے کے لئے ساری تدبیریں اختیار کر لیتا ہے۔ تو اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے۔ کہ شاید میری تقدیر ہی ایسی ہے کہ مجھے اپنے معشوق کی محبت کا دیدار نہیں ہو پا رہا ہے۔ معشوق کی جدائی کو قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔ دکھ اور غم کی حالت میں عاشق کو کچھ خیال نہیں آتا ہے۔ کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے، عاشق کا جو پیغام قاصد لے کر جاتا ہے، اس پر قاصد کو برا بھلا کہنا معشوق کی عجیب طرح کی بے رخی ہے اور قاصد کے ذریعہ سے یہ بات عاشق تک پہنچتی ہے۔ کہ معشوق عاشق سے بات تک نہیں کرنا چاہتی ہے۔

فرقت کی شب ہے یا کہ قیامت کا روز
گردوں مگر ہے بر سر کیں تیرے واسطے

رنجش کے وقت سچ ہے نہ آیا مجھے خیال
جاتی ہے اب تو جان حزیں تیرے واسطے
کیا وہ ہر ایک کو کہتے ہیں قاصد برا بھلا
ہو سکتی ہے یہ بات کہیں تیرے واسطے
تجھ سے تو وہ بات بھی نہیں کرتے نظام
افسوس اتنی بات نہیں تیرے واسطے

یہ پوری غزل پرانی روش پر ہے۔جس میں خود کلامی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ویسے اس غزل میں جدت یا فلسفہ تو موجود نہیں ہے۔لیکن نظامؔ رامپوری کی اکثر غزلوں کا مطالعہ کرنے کہ بعد یہ پتا چلتا ہے۔کہ انھوں نے غزل کی وسعت کو محدود دائرے میں رکھا ہے۔غزل کی جو تعریف ابتدائی دور سے ہوتی آ رہی ہے۔کہ غزل نام ہے عورتوں سے باتیں کرنا، یا معشوق سے ہم کلام کرنا، اس زاوئے سے ان کی غزلیں محصور ملتی ہیں۔ان کی پوری غزل میں یہ بات ملتی ہے۔کہ یہ کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں، تو عاشق و معشوق کا سہارہ لیتے ہیں، رمز وایما، میں زمانے اور اپنی دلی کیفیت کا بیان کرتے ہیں۔جو کچھ نقس نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کو شدت کے ساتھ کسی کے سہارے پیش کیا جائے تو اس میں دلکشی نہیں آئے گی جو اس کو آزادطور پر اس موقع محل میں پیش کیا جائے۔پر یہ نظامؔ رام پوری کی اپنی خصوصیت ہوسکتی ہے۔اوران کے زمانے کا تقاضا ہوسکتا ہے کیوں کہ اس وقت جو شاعری کی جارہی تھی اس میں ایسے مجاز موجود تھے۔جب کہ نظامؔ رام پوری سے پہلے بھی اردو کے ایسے شاعر موجود تھے۔جن کے یہاں زندگی کا فلسفہ عشق و عاشقی سے اوپر اٹھ کر پیش کیا گیا تھا، جو فلسفے پیش کئے گئے تھے۔اس سے غزل کو وسعت ملی تھی۔بہرحال نظامؔ رامپوری کا اپنا یہ طریقہ رہا ہوگا، جس سے انھوں نے اپنی شاعری کو سنوارا۔

میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوئے
کیا خوشی آپ کو یہ بھی نہ ہوئی
پوچھنے والوں نے مارا مجھ کو
کیا کہوں واں گزارا بھی نہ ہوئی

رہ گئی حسرتیں باقی دل میں
کچھ ملے پر بھی تسلی نہ ہوئی
غیر کے کہنے سے ہم سے روٹھے
بات یہ بھی تو کچھ اچھی نہ ہوئی
نہ تو موت آئی نہ وصل اس کا ہوا
آرزو ایک بھی اپنی نہ ہوئی
ہم سے ملنے نہیں دیتے غیر
اس میں کچھ آپ کی مرضی نہ ہوئی
یوں بتوں کی ہو خدائی تابع
یا خدا تیری خدائی نہ ہوئی
کیا تیرے ہوتے بھلا جانے ہم
وصل کی شب کبھی روزی نہ ہوئی
رہ گئے دیکھ کے ہم حسرت سے
ان کے در تک جو رسائی نہ ہوئی
کوئی امید بھر نہ آئی نظام
کوئی خواہش میرے دل کی نہ ہوئی

نظاؔم رام پوری کی اس غزل میں عاشق کی رجائیت اور مایوسی ہے۔ عاشق اپنے معشوق کی محبت کے لئے تڑپتا اور ترستا رہتا ہے۔ لیکن کبھی بھی اسے یہ نصیب نہ ہوا کہ کبھی اس سے ملاقات کر سکے اور محبت بھری بات کر سکے۔ عاشق خود ہی کہہ رہا ہے۔ کہ اگر میں مر جاوں تو معشوق میرے مرنے پر بھی راضی نہ ہوگی، یعنی مرنے کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ غزل میں عشق و عاشقی کی جو کشمکش اور تصادم موجود ہے۔ وہ پوری عشقیہ غزل کی تصادم اور کشمکش ہے۔ جس میں عاشق معشوق سے زیادہ غیروں پر توجہ دیتی ہے، اور عاشق غیر کی طرف اس کی توجہ کو دیکھ کر بہت ہی ملال کا شکار ہو

جا تا ہے۔ایک مصرعہ نظاؔم رام پوری کا ہے۔کہ محبوب کو اپنے بتوں سے تعبیر کیا اور پھر بتوں کو خدائی کا درجہ دیا پھر عاشق اس حد تک عشق میں گرفتار ہو کر کہہ رہا ہے، کہ اگر ایسی خدا کی خدائی ہو کہ انسان اس کے پیچھے سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہے لیکن اس کی توجہ اس کی طرف کچھ بھی نہیں ہے۔تو ایسی خدائی نہیں ہونی چاہیے ایسی خدائی کا کیا فائدہ، یہ بڑی بات نظاؔم رام پوری نے جدید پیرائے میں کی ہے۔پھر مزاج میں شدت لا کر اپنے آپ کو عاشق نرم زاویے میں پیش کرتا ہے، آرزو و امید کی باتیں کرتا ہے کہ کاش ہمیں تمہارا وصل مل جاتا عاشق رنجیدہ ہو کر کہہ رہا ہے۔کہ میری حسرت باقی رہ گئی اور میں اپنے معشوق سے نہ مل سکا۔ان کی غزلوں کی ایک خصوصیت یہ ہے، ان کے بیشتر غزلوں میں عاشق معشوق سے شکوہ، شکایت و خود کلامی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔لیکن طرز بیان مختلف ہے، اور الگ الگ پیرائے سے ایک ہی بات کو بیان کیا ہے جس میں کہیں کہیں جدت موجود ہے۔لیکن کہیں کہیں تکرار بھی پایا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ لکھنو کی شاعری، محمد باقر شمس ص13

2 ۔عوامی ستارہ یا بادبان، حسن عسکری ص901

3 ۔مکاتیب ومضامین شاد عارفی مشمولہ۔ از مرجبہ یہ خیر مظفر حنفی ص232

4۔ستارہ یا بادبان، حسن عسکری ص 252

5۔نظام رامپوری حیات اور شاعری مرتب ڈاکٹر شعائراللہ خاں وجیہی ص25

6۔شعر اقبال از سید عابد علی عابد ص54

ماحصل

ماحصل

نظآم رامپوری کی پیدائش 1239ھ مطابق 1823ء میں محلّہ گھیر سخی میں ہوئی۔ نظام کا نام سید نظام شاہ اور تخلص نظآم تھا۔ ان کے والد کا نام سید احمد شاہ تھا۔ نظآم کے نام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بقول راز یزدانی:

''نظام کا اصل نام جو ان کے باپ نے رکھا وہ ذکریا شاہ تھا۔ نظام کی مہر کے خاکے کا ڈیزائن ذکریا شاہ کے نام سے تھا۔''1ے

راز یزدانی صاحب نے اس کا ذکر تو کیا رضا لائبریری میں اس مہر کو بہت ڈھونڈا گیا مگر یہ آج تک کسی کو نہ مل سکی اور نہ ہی اس مہر کا عکس یا فوٹو مل سکا۔ قدرت رام پوری نے ان کی کلیات کو شائع کرایا تو انھوں نے بھی سید ذکریا شاہ کا انکار کیا، اور سید نظام شاہ اور تخلص نظآم کلیات میں درج کیا۔ امیر اللہ تسلیم نے بھی اپنی تقریظ میں سید نظام شاہ لکھا ہے۔ امیر مینائی انتخاب یادگار میں رقمطراز ہیں:

''نظام تخلص، سید نظام شاہ ابن سید احمد شاہ بڑے خوش فکر اور خوش مزاق، شعری عاشقانہ کہنے میں طاق تھے۔'' 2ے

خود نظام نے بھی اپنی شاعری میں اپنے نام کا ذکر کیا ہے۔

در پر کھڑے ہیں اس لئے سید نظام شاہ
محفل میں ہم کو اپنی بلائیں کسی طرح
کہتے ہیں دیکھ دیکھ کے رسوائیاں میری
سید نظآم شاہ نے رسوا کیا مجھے

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی مشہور و معروف کتاب تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں:

''نظام شاہ کا پورا نام سید نظام شاہ اور نظام تخلص تھا۔''3؎

ان تمام مذکورہ بالا حوالا جات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظاؔم رام پوری کا اصل نام سید نظاؔم شاہ اور تخلص نظاؔم ہے۔ راز یزدانی صاحب نے جو نظاؔم رام پوری کے بارے میں کہا کہ ان کا نام ذکریا شاہ ہے اور ایک مہر کا ذکر کیا۔ لیکن اس بات کے ثبوت میں ان کے پاس کوئی پختہ دلیل نہ ہونے کی وجہ سے میں ان کے قول سے متفق نہیں ہوں۔ ہاں تحقیق میں کوئی لفظ حرف آخر نہیں ہوتا اگر مستقبل میں وہ مہر کہیں سے دستیاب ہو جائے تو ان کے نام کے بارے میں مزید انکشافات ہو سکتے ہیں۔

نظاؔم رامپوری کا خاندان روہیل کھنڈ آنے سے قبل پاکستان یوسف زئی علاقہ میں مقیم تھا۔ نظام کے اجداد میں عبداللہ شاہ کو آنولہ آنے کی دعوت علی محمد خان نے دی۔ ان کے بعد سادات جیلانی اور سادات ترمز اور سادات بخارہ کے بزرگوں کو نواب علی محمد خان نے آنولہ بلایا۔ یہ لوگ ان کی دعوت پر آنولہ تشریف لائے۔ اس وقت زیادہ تر آنولہ میں پٹھان قوم کے لوگ مقیم تھے۔ اس وجہ سے یہ پٹھانوں کا محلّہ کہلایا۔ ان کی زبان پشتو اور ان کا حلیہ پگڑی والا تھا۔ نظاؔم رامپوری کے جد اعلی سید عبداللہ شاہ روہیل کھنڈ میں پیر کی حیثیت سے جانے جاتے، اس وقت نواب علی محمد خاں بانی روہیل کھنڈ ان کے مرید تھے۔ سید عبداللہ کے فرزند سید محمد شاہ ان کے بیٹے عبدالقادر نے رامپور میں پرورش پائی، ان کے دو بیٹے فتح علی شاہ و چراغ علی شاہ۔ فتح علی شاہ کے دو بیٹے سید محمد شاہ اور سید احمد شاہ یہ نظام رامپوری کے والد ہیں

شہر رامپور ضلع رامپور کا صدر مقام ہے، یہی وہ ضلع ہے جو ریاست رام پور کے نام سے انتہائی عظمت واہمیت کا حامل تھا۔ کہا جاتا ہے، کہ اس ضلع کی آبادی سے قبل یہاں 'رمپورہ' نام کا ایک گاؤں تھا۔ جس کے نام پر اس ریاست کا نام رامپور پڑا۔

رامپور ریاست کی اگر قدیم تاریخ کی بات کی جائے تو تقریبا پانچ ہزار سال پرانی تاریخ ہے۔ جو اس ریاست سے جڑی ہوئی ہے۔ تین ہزار قبل مسیح ایک ہندو راجہ سروا نے دریائے گنگا کے کنارے سیفنی گاؤں کے پاس قلعہ تعمیر کرا کر اپنا اقتدار مضبوط کیا۔ قلعہ شیو پوری دیہات میں آج بھی موجود ہے اس راجہ کا تعلق گوجر سے تھا یہیں سے ریاست رام پور کا کی تاریخ کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔ مگر اس کی باقاعدہ تاریخ کشتوریوں کے عروج سے ہوئی جنھوں نے

یہاں کا قلعہ تعمیر کرایا، جس میں روہیلوں کا قبضہ ہوا اور نواب بھی اس قلعہ کو اپنے قبضے میں لیے۔ یہاں ترکوں کی دہلی آمد کے ساتھ یہ ترک سلاطین رامپور کی ریاست میں بھی آ چکے تھے۔ اور روہیلو کی آمد سے یہاں پر پٹھانوں کی آبادی تیز ہوئی پہلے آبادی بلاسپور میں زیادہ ہوئی۔ اسی طرح احمد شاہ ابدالی کی فوج کے ساتھ ترک لوگ بھی جگہ جگہ رام پور میں آباد ہو گئے تھے۔ جس میں نواب فیض اللہ خان نے اس شہر میں اپنی رہائش گاہ کا قیام کیا پھر یہیں سے نوابوں کا سلسلہ اس ریاست میں چل پڑا اور اس ریاست کے پہلے نواب نواب فیض اللہ خان تھے۔

رام پور کی ریاست ایسی ریاست تھی جس کے اندر اردو شاعری و ادب کی ترقی ہوئی۔ جس طرح دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ، دبستانِ عظیم آباد، وغیرہ نے اردو زبان و ادب کی آبیاری کی تو اس میں ریاست رام پور نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ دبستان ان دبستانوں سے الگ ہے۔ کیونکہ اس دبستان کا وجود اس وقت ہوا جب اردو کے دوسرے دبستان ہنگامہ وقت کے شکار تھے۔ 1857ء کی ناکام بغاوت سے دلی اجڑ چکی تھی۔ ہر جگہ افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اس سے ہر زبان کے شعراء بھی متاثر ہوئے تھے۔ ملک میں امن و امان کی جگہ لکھنؤ اور رامپور میں ہی تھی۔ یہاں کے راجاؤں اور نوابوں نے سخاوت کو پیش کرتے ہوئے دلی، لکھنؤ کے شعراء کو اپنے یہاں جگہ و پناہ دی۔ رامپور ایک چھوٹی سی ریاست تھی مگر اس کے حکمران اور نواب بلند حوصلے کے مالک تھے۔ جب اردو شعراء تنگدستی کے شکار ہوئے تو غالب جیسے بڑے شاعر جو مالی پریشانی میں گرفتار تھے۔ اسی ریاست کے نوابوں نے انہیں آسرا اور سہارا دیا اور ان کے لیے پینشن بھی مقرر کی، بہادر شاہ اور واجد علی شاہ کی اعانت سے محروم لکھنؤ کے اکثر شعراء نے رامپور میں پناہ لی۔ والی رامپور یوسف علی خان ناظم جو خود شاعر تھے۔ انہوں نے ان شعراء کی حوصلہ افزائی کی دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں کو اپنی پناہ میں لیا اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ رام پور کی دبستان ایسی ہے کہ انہوں نے پوری اردو دبستان کو سہارا دیا اور لکھنؤ اور دہلی دبستان کا سنگم بنا اور ایک نئے دبستان کی بنیاد پڑی، اس دبستان کے روح رواں نواب ناظم علی خان تھے۔ پھر ان کے جانشین کلب علی خاں ہوئے وہ بھی شاعر اور شاعر نواز تھے۔ ان لوگوں کی سرپرستی میں اس دبستان کو فروغ

حاصل ہوا، دبستان رامپور کے کلام میں اشتراکیت صفت موجود جس میں مشکل بندی، اور آسان پسندی دونوں کا سنگم دہلی اور لکھنو کے دبستان کی شیر وشکر ہے۔ جو شعراء لکھنو سے رامپور پہنچے تھے۔ تو ان میں کچھ شعرا کو یہ احساس ہوا کہ ہمیں مشکل پسندی سے دوررہ کر سادگی اور معنی آفرینی کو اپنانا چاہیے۔ جو دبستان دہلی کی خصوصیات تھی۔ ان شعرا کو اسی طرح توجہ دلانے میں دبستان رامپور کا بہت بڑا ہاتھ رہا شاعروں کے کلام میں سادگی، زبان میں رنگینی، ورعنائی دینے کا سہرا دبستان رامپور کے سر جاتا ہے۔ اس دبستان سے کی شعراء شاعری سے جڑے ہوئے تھے جس میں خود نوابین ریاست رامپور بھی تھے۔ ان نوابوں میں اردو کے اچھے اور اہم شاعر بھی تھے۔ جیسے نواب یوسف علی خاں ناظم

نواب کلب علی خاں۔ رام پور میں کئی شہروں کے شاعر ہجرت کر کے پہنچے جن میں حیدر آباد، بھوپال ٹونک کے علاوہ دلی لکھنو کے شعرا کی بڑی تعداد رامپور پہنچی۔

ریاست رامپور کے والی یوسف علی خاں ناظم نے ان شاعروں کی حوصلہ افزائی کی جن بڑے شاعروں کی اس نواب نے سر پرستی کی ان میں امیر مینائؔی، داغؔ دہلوی، اور جلال لکھنوی کا نام کافی ہے۔ اہمیت کا حامل ہے پر یہ بات حقیقت پر منحصر ہے۔ کہ رامپور کی دبستان نہ تو دلی دبستان اور نہ ہی لکھنؤ کی دبستان کی ہم پلہ تھیں۔ لیکن اس دبستان میں اتنی خصوصیت ضرور تھی کہ اس نے اردو شعر وادب کی خوب خدمت کی اور اردو ادب کو بلندیوں تک پہنچانے میں کافی کام کیا ہے۔ اس دبستان میں فن شاعری کو قواعد لغت وغیرہ پر کئی کام ہوئے شاعری کے جملہ اصناف کے ساتھ نثری اصناف کی بھی اس دبستان میں خوب خدمت ہوئی، اس دبستان کی زبان میں رعنائی کے ساتھ سادگی ہے۔ اس طرح اس دبستان نے اردو شاعری کو ایک الگ نیا رنگ وآہنگ عطا کیا، جس پر ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ اردو کے نثری و شعری اصناف پر دبستان رامپور کا بہت احسان ہے۔

نظاؔم رامپوری نے خاص طور سے وصال وہجر کی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے، نظام اس بات کی طرف قارئین کی توجہ کرانا چاہتے ہیں۔ جو ہر محبت کرنے والواں کے درمیان ہجر و وصال کی کیفیت میں پایا جاتا ہے ان کا کہنا ہے۔ بلا شبہ ایک محبّ اپنے محبوب کے ہجر میں جو پیچ وتاب کھاتا ہے۔ دردناک ہے، لیکن اس ہجر کی وجہ سے اس کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور وہ وصال کی خواہش بار بار کرتا ہے، لیکن جب وصال کا وقت یا موقع نزدیک ہوتا ہے۔ تو

محبوب اور بے قرار رہتا ہے ،ہجر و وصال کا منظر جو نظاؔم نے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔لا جواب ہے ۔ان کا اسلوب عام فہم ہے جو قارئین کی فہم وفراقت میں بہت تیزی سے جگہ بنالیتا ہے۔

نظاؔم رامپوری دبستان رامپور کے چنندہ شاعروں میں سے تھے ۔ان کی شاعری میں تغزل، معاملہ بندی، اور تصوف کے ساتھ عشق حقیقی وعشق مجازی پنہاں ہے۔

تغزل: غزلیہ شاعری کو کہتے ہیں، جس میں غزل کے لوازمات کے ساتھ عشق و عاشقی کی روداد پنہاں ہوتی ہے نظام کی شاعری کا اکثر حصہ اسی بنا پر منحصر ہے۔

تصور آپ کا ہے اور میں ہوں
یہاں اب مشعلہ ہے اور میں ہوں

معاملہ بندی: جس میں نجی واقعات کا بیان شاعر عشقیہ رمزات کے ساتھ کرتا ہے۔اردو ادب میں معاملہ بند شعراء کے یہاں اکثر عریاں مضامین وصل کی خواہشات و آرزو پائے جاتے ہیں۔نظاؔم رامپوری کے یہاں بھی اس طرح کی شاعری موجود ہے۔جس میں عریاں مضامین اور نجی واقعات پیوست ہیں۔مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جس میں یہ چیزیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ایسے کو شب وصل لگائے کوئی کیا ہاتھ
ہر بار جھٹک کر جو کہے ٹوٹے تیرا ہاتھ
اس دست نگاریں کو ذرا میں نے چھوا تھا
کس ناز سے کہنے لگے اف چھوڑ، گیا ہاتھ

تصوف اردو شاعری میں بہت رچی بسی ہے۔جس کے اندر شاعری ایسے واقعات کو پیش کرتا ہے۔جس میں دنیا کی بے ثباتی کو اجاگر کیا جاتا ہے۔اور خود شاعر دنیا و مافیھا سے الگ ہو کر صرف اللہ کی یاد میں محو رہتا ہے۔نظاؔم رامپوری نے بھی اپنی شاعری میں تصوف کو برتا ہے۔ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے اپنے آپ کو دولت و دنیا کی چمک سے دور رکھا ہے۔

دولت فقر ہے آل شہ جیلاں ہوں

نظام کیا غرض اس سے میرے ہاتھ میں ذر ہو کہ نہ ہو

عشق مجازی: جس کے اندر دنیاوی محبوب ومعشوق کی محبت کی روداد ہوتی ہے نظام کی شاعری میں عشق مجازی کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔

جھپکی الٰہی آنکھ کہیں اضطراب میں
جا گے میرے نصیب جو وہ آئے خواب میں

عشق حقیقی: اس سے اصل محبت، محبت الٰہی مراد ہوتی ہے۔ جس میں شاعر اللہ کی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ نظام رامپوری نے بھی ایسے اشعار لکھے ہیں، جس میں عش حقیقی موجود ہے۔

اور اب کیا کہیں کہ کیا ہیں ہم
آپ ہی اپنا مدعا ہیں ہم
ایسے عاشق ہیں اپنے وارفتہ
آپ ہی اپنے دل رہا ہی ہے ہم
عشق جو دل میں درد ہوکے رہا
خود اسی درد کی دوا ہیں ہم

دہلی ولکھنؤ کے دبستان کی ممیّزات ان کی شاعری کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ یہ اردو کے معاصر اور بڑے شعراء کی روش پر چلے ہیں۔ جن میں ولؔی، میرؔ، دردؔ، غالبؔ ہیں۔ نظام رامپوری کی غزلوں میں عشقیہ جذبات کی کثرت کے ساتھ ہجر وصال، مایوسی کو بڑی ہنرمندی اور متاثر انداز میں پرویا گیا ہے۔ نظامؔ رامپوری کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے۔ کہ انہوں نے غزل کو ایک دائرے میں رکھا ہے۔ جس میں عشق وعاشقی اور محبت کے ساتھ دلی کیفیت کا بیان ہے۔ اور زندگی کے تصادمات اور کشمکش، بھی موجود ہے۔ عشق کی ناکامی پر آہ وفضا کرنا، ملال وشکوہ کرنا ان کی اکثر غزلوں میں موجود ہے۔ جس میں عاشق کی بے توجہی معشوق کی شدت محبت ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں بہترین الفاظ اور اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ صنائع و بدائع کے ذریعے انہوں نے اپنی شاعری کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ جس میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، تجنیس، تضاد، تلمیح وغیرہ صنائع و بدائع کا استعمال بھی انہوں نے کیا ہے۔

مجموعی طور پر نظاؔم رامپوری کلاسیکی دور کے ایسے شاعر تھے۔ جو کچھ حد تک اردو ادب میں گم نامی کی زندگی جیئے لیکن ان پر ادیبوں اور ناقدوں نے بہت کچھ تو نہیں لکھا ہے۔ لیکن کہیں کہیں امیر مینائیؔ، نیاز فتح پوری وغیرہ کی تحریروں میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ بعد کے محققین میں جمیل جالبی وغیرہ نے ان کی سوانحی کوائف کو پیش کیا ہے۔ یہ ایک ایسے شاعر ہیں۔جن کے کلام میں یک رنگی پائی جاتی ہے۔

نظاؔم رام پوری کی شاعری میں اگر فلسفہ کی بات کی جائے تو کوئی زندگی کا فلسفہ نہیں ملتا ہے، اور کہیں ان کی غزلوں میں زندگی جینے کا فلسفہ ضرور مل جاتا ہے۔ کہ انسان کو کسی بھی مصیبت سے گھبرانا نہیں چاہئے اس امید کو برقرار رکھنا چاہیے اور یہ فلسفہ ان کے عشقیہ بیان سے ان کی غزلوں میں اجاگر ہوتا ہے۔

نظام کی شاعری کا موضوع وسیع ہے۔ مگر ان کی شاعری کا موضوع مرکزی، اساسی عشق ومحبت ہے۔ ان کے یہاں عشق میں ناکامی نامرادی اور مایوسی واداسی کے ساتھ ساتھ عشق نشاط انگیزی ومسرت کا بھی کہیں نہ کہیں ذکر ہے۔ وہ عشق کے ساتھ زندگی کو خوشگوار کرنے کی کوشش میں مسلسل لگے ہوئے ہیں۔

نظاؔم کی شاعری میں حسن وعشق داخلی کیفیت کے حاصل ہیں۔ ان کے شاعری میں حسن اور عشق کا رشتہ آپس میں بہت مضبوط ہے۔ اصل میں نظاؔم رامپوری نے زندگی کو جس طریقے سے بسر کیا اسی طریقے سے اپنی شاعری میں بیان کر دیا۔

نظاؔم رامپوری کی اصل زندگی بہت دُکھ درد ومصیبت میں گزری مگر ان کی شاعری میں زندگی سے محبت اور محبوب کی نافرمانی دکھائی دیتی ہے۔ نظاؔم نے بہت تنگ دستی کی حالت میں زندگی بسر کی لیکن اس کے باوجود بھی قانع تھے۔ درباروں سے وابستہ ہونے کے باوجود بے نیاز تھے۔ ان کی شاعری میں محبوب کے ہجر وصال اصل میں غزل کے معنی عورتوں کے ساتھ گفتگو اور عشق کے ہیں۔ نظاؔم کی غزل اسی مزاج کی حامل ہے۔ جس میں انھوں نے عورتوں کے تعلق سے عاشقانہ جذبات ومحبت ومعاملات کا مزے کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ جس زمانے میں انھوں نے شعور کی آنکھ کھولی تو اس وقت رامپور میں شعر وشاعری کا ایک ماحول تھا یہ گھر میں شاعر تھے اور شعر وشاعری کا چرچہ عام تھا۔

نظاؔم کی شاعری میں زندگی کی حقیقتیں، لوگوں کی فریبیاں، نفسیات کی باریکیاں شاعری میں منظر نگاری کے نمونے بہت سے ملتے ہیں۔ ابتدا میں یہ نمونے مثنوی وغیرہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک طریقے کی مصوری یا

پینٹنگ ہے،خیال کی تصویریں جوذہن کی قرار ہیں نقشہ کھینچ دیں لفظوں کی بناوٹ پھرانھیں سانچہ میں ڈھالنے کے ساتھ ساتھ اپنی بات کہنے کے لئے ان کا استعمال کرنا وہ بھی شاعری کے اندر یہ صفت نظام رامپوری کے اندر موجود ہے۔وہ زندگی معاشرت اورعہد کے مظاہرے دورزندگی کے واقعات کواپنی شاعری میں کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ایک منظرکشی ہوجاتی ہے۔شاعری کو پڑھتے ہوئے انسان کے سامنے ایک تصویر پر گھومنے لگتی ہے۔

نظام رامپوری کی اس غزل کواگر گہرائی سے پڑھیں گے۔تو یہ بات کھل کرسامنے آئے گی کہ ان کی عشقیہ غزل میں کچھ اپنے زمانے کچھ افراد زمانے سے شکایت کی گئی ہے۔وہ معشوق کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ کیئے ہیں۔آج ہمارے زمانے میں جس قسم کی محبت ہے،اس میں کہیں نہ کہیں کمی آچکی ہے۔جوکی ماضی کی محبت میں بھرپور ہے۔لیکن یہ بات بتانے کی ہے۔جب ہم ولی سے لے کرشجاع خاور،تک کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں توسب کی شاعری میں اپنے زمانے سے شکایت اور پچھلے وقت کی خوش گواری کو یاد کیا جاتا ہے۔لیکن میرے مطالعے کے مطابق اس میں شاعروں کی کچھ شکایت تو رسمی ہے۔اور کچھ حقیقی بھی ہوسکتا ہے۔داغ دہلوی اورنظام کا زمانہ ایک ہی ہے۔اس زمانے کے اکثر شاعروں نے اپنی ماضی کو یاد کیا ہے۔دور حاضر کے شعرا ندا فاضلی انبر بہرائچی وغیرہ نے اپنے سے پہلے زمانے کی خوشگوار کیفیت کو یاد کر کے زمانے حال کی جزاوفزاع کرتے ہیں کل ملا کر نتیجہ یہ نکلتا ہے۔کہیں نہ کہیں اس میں انسانی فطرت کا اثر زیادہ ہے انسان اپنی قدر اوراپنے گردوپیش کی قدر کم کرتا ہے اوراسے دور کی چیزیں زیادہ اچھی لگتے ہیں،بہرحال یہ سماجی مسئلہ ہے جس پر بحث ہوسکتی ہے۔

نظام شاعری میں یک رنگی ادابندی اورمعاملات عشق سے باہرنہیں نکل پاتے،اس وجہ سے ان کی شاعری کا دائرہ محدود ہوگیا ہے،جس طریقے سے غزل کی عام روایت رہی۔مگرانھوں نے اپنی شاعری میں ادائیں
اورعشق کی آرزومندی اوران کی جہتوں کوالگ الگ انداز میں استعمال کرنے کی بھرپورکوشش کی ہے۔اس طریقے سے نظام شاعری پرقابض ہوگئے۔اسی انداز میں معاملات اور کیفیت کو بیان کیا،ایک طریقے کی مصوری کا حق ادا ہوگیا۔
نظام کی ادابندی کے تعلق سے شوکت علی خاں لکھتے ہیں۔

> ’’غرض نظام کا ادا بندی جذبات نگاری میں مرتبہ اتنا بلند ہے کہ جرأت کا خیال
> وہاں تک نہیں رسا ہوتا۔وہ اپنے مصورانہ کمال کے لئے دنیائے شعروادب میں

یکتا اور منفرد ہیں۔اب تک ان کا جو کلام دیوان کی شکل میں منظر عام پر آ چکا ہے۔ وہ رطب و یابس سے بھرا پڑا ہے۔انہیں ابھی تک کوئی حالی جیسا دیدہ ور میسر نہیں ہوا ہے۔اردو ادب میں وہ جس مقام و مرتبہ کے مستحق ہیں اسی کمی کے باعث وہ انکو حاصل نہیں ہوسکا۔'' 4

ادا بندی نظام کو اردو شاعری میں انفرادیت عطا کرتی ہے۔اور انہوں نے اپنی شاعری میں ادا بندی کو بہترین طریقے سے استعمال کیا ہے۔جس میں انہوں نے محبوب کی محبوبیت، کیفیت اور اس کے واردات اور معاملہ جن کا واسطہ مجازی جذبات سے ہوتا ہے۔انہیں تمام رموز و،اوقاف کو انہوں نے برجستگی کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔اسی لئے اس تعلق سے شوکت علی خاں لکھتے ہیں۔

''لیکن نظام اردو شاعری میں جس وجہ سے تاریخ شاعر تسلیم کیے گئے ہیں وہ ہے ان کی ادا بندی شاعری انہوں نے اس رنگ کی ابتداء بھی کی اور انتہا بھی وہ اس رنگ کے موجد تھے داغ اور امیر مینائی نے اس رنگ کا اثر قبول کیا اور اسینے پورے ہندوستان میں دھوم مچائی دور حاضر میں یہی رنگ سلامت اور شائستگی کے ساتھ حسرت موہانی اور فراق کے یہاں نظر آتا ہے۔'' 5

اس طرح سے ہم دیکھ سکتے ہیں۔کہ نظام اپنے ادا بندی اور جذبات نگاری میں اپنے دور کے کلاسیکی شاعروں کو بھی پیچھے چھوڑا ہے۔جس کی بنا پر وہ اپنے مصورانہ ہنرمندی اور تمثیلی خیال کی وجہ سے دنیا دنیائے شعر و ادب میں انفرادیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔نظام رامپوری حیات اور شاعری مرتب ڈاکٹر شعائراللہ خاں وجیہی ص48

2۔انتخاب یادگار از امیر مینائی ص386

3۔تاریخ ادب اردو جلد چہارم از ڈاکٹر جمیل جالبی ص 492

4۔نظام رامپوری حیات اور شاعری مرتب ڈاکٹر شعائراللہ خاں وجیہی ص184

5۔ایضا۔184

کتابیات

نمبر	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	آل احمد سرور	نظر اور نظریے	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	1973
2	انیس اشفاق، ڈاکٹر	اردو غزل میں علامت نگاری	اتر پردیش اردو اکیڈمی	1995
3	ارشاد علی خاں، پروفیسر	جدید اصول تنقید	کتابی دنیا، نئی دہلی	2001
4	تنویر احمد علوی، ڈاکٹر	اصول تحقیق و ترتیب متن	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی	2009
5	جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو جلد چہارم	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی	1993
6	حامد کاشمیری، پروفیسر	اردو نظم کی دریافت	جے کے آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی	2004
7	حنیف کیفی	اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2003
8	خالد حسن خاں	تاریخ روہیلکھنڈ	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	1996

9	دورآفریدی	تاریخ روہیلکھنڈ ۱۵۰۰قبل مسیح تا۱۹۸۵ء	نیو پبلک پریس، دہلی	1986
10	دولہا جان خاں، منشی	یہ رامپور ہے	ناظم پریس رامپور	1955
11	ذکیہ جیلانی، ڈاکٹر	کلیات ناظم	لیتھو کلر پرنٹس، دہلی	1985
12	رحمت یوسف زئی	اردو شاعری صنائع وبدائع	اردو صفحہ ساز کمپیوٹر کارپوریشن ،حیدرآباد	2003
13	سعود الحسن خاں روہیلہ	رامپور تاریخ وادب	ابلاغ پبلشرز اردو بازار لاہور	2003
14	شمس الرحمٰن فاروقی	اردو غزل کے اہم موڑ	غالب اکیڈمی، نئی دہلی	2006
15	شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	1992
16	شوکت علی خاں ایڈوکیٹ	تاریخ رامپور 1930 تا 1949	ناشر رامپور رضا لائبریری	2002
17	عتیق جیلانی رنگ	ریاست رامپور کا سیاسی پس منظر	ناظم پریس، رامپور	1945
18	عنوان چشتی، پروفیسر	عروضی اور فنی مسائل	اردو سماج جامعہ نگر، نئی دہلی	1985
19	شمیم حنفی، مظہر مہدی (مرتبین)	آزادی کے بعد اردو نظم	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2005

20	عنوان چشتی، پروفیسر	عروضی اور فنی مسائل	اردو سماج جامعہ نگر، نئی دہلی	1985
21	فرمان فتحپوری	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2017
22	کلیم الدین احمد، پروفیسر	اردو شاعری پر ایک نظر	ایوان اردو، پٹنہ	1966
23	کنول کرشن بالی	آزاد نظم اردو شاعری میں	کتاب پبلشرز، لکھنو	1995
24	گوپی چند نارنگ	اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2009
25	گوپی چند نارنگ	ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	1993
26	گوپی چند نارنگ	ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2003
27	گیان چند جین	تحقیق کا فن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2005
28	محمد اجمل سروش	اردو غزل میں عروضی تجربات	روہی بکس فیصل آباد	2016
29	محمد ہادی	زبان اور شاعری	مجلس ترقی ادب، لاہور، پاکستان	1984
30	ممتاز الحق، ڈاکٹر	جدید غزل کا فنی وسماجی مطالعہ	عفیف آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	2004

31	نفیس صدیقی	تاریخ روہیلہ 1707 ۔1774	پبلشرز رامپور رضا لائبریری	2004
32	نورالحسن نقوی، ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	2009
33	وزیر آغا ،ڈاکٹر	اردو شاعری کا مزاج	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ	1974
34	وزیر آغا ڈاکٹر	نظم جدید کی کروٹیں	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ	2000
35	وسیم بیگم	آزادی کے بعد اردو غزل مضمرات وممکنات	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	2009
36	ہوش نعمانی	ادب گاہ رامپور	پبلشرز رضا لائبریری، رامپور	1997
37	یوسف حسین خان	اردو غزل	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ	2010

رسائل وجرائد

1	آج کل (ماہنامہ)	نئی دہلی	2020
2	اردو دنیا (ماہنامہ)	نئی دہلی	جولائی 2009
3	انتساب عالمی (سہ ماہی)	بھوپال	اکتوبر/ دسمبر 2014
4	ذہن جدید (ششماہی)	دہلی	مارچ / اگست 2000
5	شاعر نامہ (ماہنامہ)	دہلی	دسمبر 1998
6	فکر نظر (سہ ماہی)	علی گڑھ	جون 2016

7	ایوان اردو (ماہنامہ)	نئی دہلی	مئی 2014
8	اسباق	پورنیہ	جولائی 2013
9	ایوانِ اردو	دہلی	مارچ 2019
10	فکر وتحقیق (سہ ماہی)	نئی دہلی	مئی 2014
11	ارتقاء (سہ ماہی)	بنارس	جولائی تا ستمبر 2021
12	سب رس (ماہنامہ)	حیدرآباد	اکتوبر 2009
12	نیا دور (ماہنامہ)	لکھنؤ	مارچ 2010
13	سبقِ اردو	بھدوہی	نومبر 2020
14	شعر وحکمتسہ ماہی)	حیدرآباد	اپریل 2013
15	تحریکِ ادب(سہ ماہی)	بنارس	2015
16	ثالث (سہ ماہی)	مونگیر	اپریل تا جون 2021
17	عکسِ ادب	اورنگ آباد	جنوری تا مارچ 2020
18	قومی زبان (ماہنامہ)	حیدرآباد	مارچ 2019
19	بھاشا سنگم (سہ ماہی)	پٹنہ	اپریل تا جون 2017

☆☆☆☆☆